رپورٹ علماء سیمینار

پرامن اور متوازن معاشرے کے قیام میں علماء کا کردار

22،23 جون 2011ء

پاک انسٹیٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS)، اسلام آباد

PAK INSTITUTE FOR PEACE STUDIES
KNOWLEDGE FOR PEACE

علماء سیمینار رپورٹ

پرامن اور متوازن معاشرے کے قیام میں علماء کا کردار

22,23 جون 2011ء

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز، اسلام آباد

www.san-pips.com

فہرست

تعارف **5**

پُرامن اور متوازن معاشرے کے قیام میں علماء کا کردار (افتتاحی نشست) **6**

افتتاحی کلمات؛ محمد عامر رانا 6

صدارتی خطبہ؛ مولانا محمد خان شیرانی 7

پُرامن اور متوازن معاشرے کے خدوخال (پہلی نشست) **11**

عالمی وعلاقائی تناظر؛ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ 11

سماجی ومعاشی تناظر؛ ڈاکٹر سید محمد نجفی 13

فرقہ ورانہ ہم آہنگی؛ مولانا عطاء اللہ شہاب 15

فکری تناظر؛ ڈاکٹر خالد ظہیر 17

صدارتی خطبہ؛ مولانا محمد حنیف جالندھری 19

وقفۂ سوالات 21

پاکستان میں پُرامن معاشرے کے قیام میں درپیش چیلنجز (دوسری نشست) **24**

پنجاب کا تناظر؛ مولانا ڈاکٹر راغب نعیمی 24

خیبر پختونخوا کا تناظر؛ ڈاکٹر قبلہ ایاز 26

سندھ کا تناظر؛ قاری ضمیر اختر منصوری 28

بلوچستان کا تناظر؛ علامہ اکبر حسین زاہدی 30

کشمیر کا تناظر؛ مولانا قاضی محمود الحسن اشرف 32

صدارتی خطبہ؛ علامہ سید فرحت حسین شاہ 33

وقفۂ سوالات 35

پُرامن معاشرے کے قیام میں علماء کا کردار (تیسری نشست) **38**

مقررین؛ مولانا یٰسین ظفر 38

ڈاکٹر اَبوالحسن شاہ 41

علامہ سید جواد ہادی 42

مولانا عمار خان ناصر 44

صدارتی خطبہ؛ ڈاکٹر خالد مسعود 46

وقفۂ سوالات 47

مشاورتی گروپوں کی تجاویز **52**

پہلا گروپ؛ فرقہ واریت کے خاتمے میں علماء کا کردار 52

دوسرا گروپ؛ پُرتشدد رجحانات کے خاتمے میں علماء کا کردار 53

تیسرا گروپ؛ بدامنی اور عدم توازن کے سیاسی، سماجی اور معاشی محرکات اور ان کا تدارک 54

چوتھا گروپ؛ برداشت کے کلچر کا فروغ کیسے ہو؟ 56

پانچواں گروپ؛ مدارس کا کردار 58

آخری نشست **60**

صدارتی خطبہ؛ مولانا مفتی منیب الرحمان 60

اختتامی کلمات؛ محمد عامر رانا 64

تعارف

پاکستان کی سلامتی کو درپیش مسائل، معاشرے میں عدم برداشت کے بڑھتے رویے اور تشدد کے رجحانات ایک گھمبیر چیلنج بنتے جا رہے ہیں۔ ان سے نمٹنے کے لیے ریاستی سطح سے لیکر عوامی سطح تک، انفرادی اور اجتماعی کاوشوں کی ضرورت ہے۔ اسی ضرورت کے پیشِ نظر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کی کاوش ہے کہ ریاست اور دیگر سماجی و مذہبی طبقات کے ساتھ مکالمے اور مشاورت کے ذریعے ان طریقۂ ہائے کار پر غور اور اتفاق پیدا کیا جائے کہ ایک پرامن اور متوازن معاشرے کی جانب مثبت پیش رفت کی جا سکے۔

عوام کی رہنمائی، رائے اور کردار سازی میں علماء کا کردار کلیدی ہے۔ اسی تناظر میں انسٹی ٹیوٹ نے علماء کے ساتھ مکالمے اور مشاورت کے سلسلے میں اسلام آباد میں دوروزہ قومی سیمینار کا اہتمام کیا، جس میں ملک بھر سے جید علماء کرام نے شرکت فرمائی اور باہمی مشاورت سے جامع تجاویز مرتب فرمائیں، جو نہ صرف قیامِ امن میں علماء کے کردار کو واضح کرتی ہیں بلکہ ایک لائحہ عمل کی حیثیت بھی رکھتی ہیں۔ ادارہ ان تجاویز پر عمل کے لیے علماء کے ساتھ مشاورت اور تعاون جاری رکھے گا۔

زیرِ نظر رپورٹ اسی دوروزہ سیمینار کی روداد ہے اور اسے کسی قطع و برید کے بغیر پیش کیا جا رہا ہے۔

پُرامن اور متوازن معاشرے کے قیام میں علماء کا کردار

(افتتاحی نشست)

افتتاحی کلمات؛ **محمد عامر رانا**

(ڈائریکٹر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز)

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز ایک تحقیقی ادارہ ہے جو تصادم (Conflicts) کی مختلف صورتوں پر غور وفکر اور اس حوالے سے مختلف تجاویز مرتب کرتا ہے۔ اس تناظر میں ہمارا دائرہ کار دیگر غیر سرکاری تنظیموں کی نسبت خاصا محدود ہے، ہم نے PIPS کے پلیٹ فارم سے جو تحقیقی مطالعہ جات کیے ہیں، ان میں بلوچستان، شمالی علاقہ جات، کشمیر، پاکستان، افغانستان میں شدت پسندی کے عمومی رجحانات اور میڈیا کے دائرہ کار پر توجہ مرکوز کی ہے۔ شدت پسندی کا موضوع ایک ایسے مسئلہ کے طور پر ہمارے سامنے آیا ہے، جس کے کئی پہلو ہیں اور ہم نے اس حوالے سے تقریباً دو سال تک مسلسل مختلف سکالرز اور علمائے کرام کے ساتھ مشاورت کی، تاکہ پاکستان میں اور پاکستان سے باہر شدت پسندی کی کسی ایک جامع تعریف کے اُوپر اتفاق ہو سکے۔ خاص طور پر پاکستان کے تناظر میں اس کی کیا نوعیت ہے کیونکہ جغرافیائی حدود بدلنے کے ساتھ شدت پسندی کا مفہوم بھی بدل جاتا ہے۔ لیکن ہمیں ہنوز اس میں کوئی خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ کچھ وسیع دائرے تو واضح ہوئے ہیں، لیکن انہیں محدود کیا جا سکتا ہے۔ شدت پسندی ایک مربوط عمل ہے اور اس کے بہت سارے سیاسی، سماجی، معاشی اور مذہبی محرکات ہوتے ہیں۔ آج کی اس نشست کا بھی بنیادی مقصد یہی ہے کہ مکالمے اور مشاورت کے ساتھ نہ صرف اس مسئلے کو سمجھا جائے بلکہ پاکستان میں ایک پُرامن میں اور متوازن معاشرے کے قیام میں علماء کا جو ایک واضح کردار ہونا چاہیے، اس کے حوالے سے رہنمائی حاصل ہو سکے۔

معزز علمائے کرام!

جیسا کہ آپ کے علم میں ہے کہ پاکستان میں امن وامان کی صورت حال خاصی مخدوش ہے اور اس ابتری میں کمی ہونے کی بجائے مسلسل کئی سالوں سے اضافہ ہو رہا ہے۔ غیر مصدقہ اعداد وشمار کے مطابق 9/11 کے بعد سے لے کر اب تک 31 ہزار افراد ہلاک ہو چکے ہیں، جن میں سکیورٹی فورسز کے اہلکار اور عام شہری بھی شامل ہیں۔ گزشتہ سال کے جو اعداد وشمار ہیں، وہ انتہائی پریشان کن ہیں۔ اگرچہ کچھ رپورٹس تو یہ اشارہ کرتی ہیں کہ دہشت گردی کے واقعات میں 11 سے 13 فیصد تک کمی واقع ہوئی ہے لیکن اگر اس کا تقابل دنیا کے دوسرے ممالک سے کیا جائے تو پاکستان ہنوز بدامنی کے اعتبار سے سرفہرست ہے۔ ہمیں اس وقت بدامنی کی مختلف صورتوں کا سامنا ہے اور آپ کو بھی ان کا مکمل ادارک ہے۔ صرف مذہبی انتہا پسندی ہی نہیں بلکہ سیاسی وقبائلی تصادم اور پاکستان میں جرائم کی بڑھتی ہوئی شرح بھی بدامنی کی صورتیں ہیں۔ یہ موضوع خاصا وسیع ہے اور خاص طور پر جب کراچی سے خیبر تک ہمارا کوئی بھی علاقہ محفوظ نہیں ہے، چند ایک مستثنیات کے علاوہ کہ وہاں سرکاری معیارات مروجہ ہیں جن کی وجہ سے شاید وہاں امن وامان قائم ہے۔ اس پس منظر میں ایک عام آدمی اور مجھ جیسا طالب علم رہنمائی کے لیے جن مراکز کی طرف دیکھتا ہے، اس میں ایک تو

ریاست ہے اور دوسرا علمائے کرام ہیں۔ آج مجھے ان معزز علماء کے سامنے یہ بات کرتے ہوئے تکلیف محسوس ہو رہی ہے کہ ہمارے ہاں فرقہ ورانہ تقسیم گہری ہونے کی وجہ سے کئی طرح کے تصادم جنم لے رہے ہیں اور عدم برداشت بڑھ رہی ہے۔ لیکن اس کے مقابلے میں بھارت کی طرف دیکھیں، آپ تمام معزز علماء کی وہاں دوستیاں بھی ہوں گی اور ادارہ جاتی سطح پر تعلقات بھی ہوں گے۔ وہاں پر یہ تمام مذہبی جماعتیں موجود ہیں، جمعیت علماء اسلام بھی ہے، مرکزی جمعیت اہل حدیث بھی ہیں، سنی بھی ہیں اور شیعہ بھی۔ لیکن جو فکری اور مسلکی انتشار کی کیفیت ہمارے ہاں ہے، وہ ہمیں سرحد پار نظر نہیں آتی۔ خاص طور پر جب ہم یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہر میدان میں ان سے مقابلہ کیا جائے اور ان سے آگے نکلنے کی کوشش کی جائے۔

یہی وہ سوالات ہیں جن پر مشاورت اور مکالمے کے لیے آپ کو مدعو کیا گیا ہے اور میں آپ کا تہہِ دل سے مشکور ہوں کہ آپ اپنی گونا گوں مصروفیات میں سے وقت نکال کر یہاں تشریف لائے اور ایک حساس قومی وملی معاملے پر ہمیں وقت دیا۔ آپ کی تشریف آوری کا بہت شکریہ۔

صدارتی خطبہ؛ مولانا محمد خان شیرانی

(چیئرمین اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان)

اس سیمینار کا انعقاد ایک مثبت پیش رفت ہے اور اس کی ضرورت بھی تھی۔ میں کوشش کروں گا کہ یہ واضح کرسکوں کہ مشکل کہاں سے پیدا ہوتی ہے۔ انسان مادہ اور روح کا مجموعہ ہے۔ انسان اور انسانی زندگی کے لیے مادہ اور روح کی حیثیت کپڑے کے تانے اور بانے جیسی ہے، جیسا کہ کپڑے میں صرف تانا نہ کپڑا ہے اور نہ مفید اور اسی طرح بانا نہ کپڑا ہے اور نہ مفید۔ جب تک تانے اور بانے کے درمیان ایک معتدل امتزاج نہ ہو، وہ کپڑا نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح اگر انسان صرف مادے کی جانب لگ جائے تو پھر حیوانیت غالب آجاتی ہے اور اس نوعیت کی انسانی زندگی مفید نہیں ہوگی۔ دوسری جانب اگر انسان خود کو صرف روحانیت میں محو کرلے تو وہاں ملکیت تو آسکتی ہے لیکن ایسی زندگی بھی انسانی زندگی نہیں کہلائے گی اور نہ ہی مفید ہوگی۔

دو فروری 1835ء میں لارڈ میکالے نے انگلینڈ کی پارلیمان میں ہندوستان کے سفر کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا تھا کہ میں ہندوستان کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے تک پھر آیا ہوں، نہ مجھے کوئی چور ملا ہے نہ بھکاری۔ دولت کی فراوانی تھی، امن وامان بھرپور تھا، اخلاقی اقدار اعلیٰ پیمانے پر موجود تھیں، ایسی قوم پر نہ کوئی حکومت کرسکتا ہے نہ اسے کوئی فتح کرسکتا ہے۔ جب تک اسلام اور مسلمانوں کی حکمرانی برصغیر پر قائم تھی، تعلیمی اداروں کا ماحول مذہبی ہوا کرتا تھا اور علوم فنی اور دینی دونوں یکجا تھے۔ اور فنی ماہرین یعنی انجینئرز، فلکیات اور ریاضی کے ماہرین کی مذہبی ماحول میں تربیت ہوتی تھی، اس لیے ان کے اخلاق وافکار اور خیالات مذہب کے تابع ہوا کرتے تھے اور انہیں مذہبی علوم سے کافی حد تک واقفیت ہوتی تھی۔ جبکہ مذہبی علوم کے ماہرین کو فنی علوم پر دسترس ہوا کرتی تھی، اور ان دونوں میں ایک معتدل امتزاج قائم تھا، چنانچہ اس وقت معاشرہ پُرامن بھی تھا اور پُرسکون بھی۔

سب سے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ فنی علوم کے اداروں کو الگ کردیا گیا، جس کا نقصان دو طرح سے ہوا۔ ایک تو یہ کہ فنی ماہرین اپنے ماضی سے کٹ گئے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی قوم اور کوئی امت اپنے ماضی کو فراموش کردیتی ہے تو پھر وہ مستقبل میں کسی طاقتور قوت سے امیدیں وابستہ کرلیتی ہے۔ جو مذہبی ادارے تھے، ان میں فنی ودینی علوم دونوں کی تعلیم کا اہتمام تھے، لیکن ان کو اس طرح مفلوج کیا گیا کہ دفتری اور سرکاری

زبان انگریزی قرار دے دی گئی اور فارسی زبان کو داخلِ دفتر کر دیا گیا۔ اس کا نقصان یہ ہوا کہ مذہبی ماحول کے حامل اداروں سے فارغ التحصیل فنی ماہرین معاشرے میں کارآمد ثابت نہیں ہوئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ مذہبی ماحول کے اداروں میں فنی علوم کی تدریس کا سلسلہ رفتہ رفتہ ختم ہو گیا اور یہ علوم صرف فکر اور دلیل کی حد تک رہ گئے اور آج حالات اس نہج پر پہنچ گئے ہیں کہ جب دنیا عقل اور دلیل کی بات کرتی ہے، وہاں پر ہم جو ان اداروں کے تعلیم یافتہ ہیں، فتویٰ کی بات کرتے ہیں، حالانکہ فتویٰ اور دلیل میں بڑا فرق ہوتا ہے۔

اور پھر جب دوسری جنگ عظیم آئی اور اس کے نتیجے میں قابض قوت نے یہاں سے باعزت طریقے سے نکلنے کی منصوبہ بندی کی تو انہوں نے مناسب سمجھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کو تقسیم کیا جائے۔ اس خطے پر مسلمان تقریباً 800 سال تک برسرِ اقتدار رہے تھے اور اسلام بطور نظام یہاں پر رائج رہا تھا اور اس خطے کے عوام اس کے ثمرات اور فوائد دیکھ چکے ہیں، چنانچہ وہ اس خطے کو متحد چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ چونکہ ہندو مذہب میں نہ کوئی نظام حکمرانی ہے، نہ عدالتی قانون۔ اس لیے وہ پلٹ کر پھر اسلام اور مسلمان حاکم کی طرف ہی دیکھیں گے اور اگر اتنے بڑے خطے میں مسلمان برسرِ اقتدار آ گئے اور اسلام بطور نظام رائج ہو گیا تو پھر خلافت عثمانیہ کے خاتمے کا فائدہ کیا ہوا۔ اگر جنگ بھی مسلط ہوتی تو وسائل کی بہتات اور افرادی قوت کی کثرت کی وجہ سے اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ ان کی دانش اور منصوبے کے مطابق اگر ہندو اکثریتی علاقے کو ہم الگ کریں گے تو ہندو نظام اور قانون میں ہمارے دست نگر ہوں گے اور جو مسلمان اکثریتی علاقے ہیں، وہاں ہم اپنی اسٹیبلشمنٹ کو حاکم بنا دیں گے، اور اپنی اسٹیبلشمنٹ کے ذریعے اسلام کو غالب آنے سے روک لیں گے۔

اور یہ لازم ہے کہ جب حکومت عوام کے افکار و جذبات کی ترجمانی نہ کرے تو پھر اس کی مجبوری ہوتی ہے کہ عوام میں تنازعات کھڑے کر دے۔ ان حکومتوں کے لیے اپنے اقتدار اور حاکمیت کو برقرار رکھنے کے لیے مذہبی، علاقائی، قومی اور فرقہ ورانہ تعصب کو فروغ دینا ناگزیر ہوتا ہے۔ فرقہ واریت دراصل اقتدار کی ضرورت ہے، کوئی مسئلہ نہیں ہے۔

تمام علماء کرام کو معلوم ہے کہ نبوت کا راستہ بند ہو چکا ہے۔ اب کوئی انسان معصوم نہیں کہلا سکتا کہ اس کی کسی بھی رائے میں کوئی جھول نہ ہو۔ اور نبی ہی وہ شخصیت ہوتی ہے جو معصوم اور واجب الاطاعت ہے۔ آج کے زمانے میں اگر کوئی بہت بڑا عالم ہوگا تو وہ مجتہد بنے گا اور مجتہد مصیب بھی ہو سکتا ہے اور مخطی بھی، اور وہ واجب الاطاعت نہیں ہے۔ ہر مجتہد کا اپنے اجتہاد پر عمل کرنا واجب ہے۔ لیکن اجتہاد کو تحمیل کرنا اس کا حق نہیں۔ اس حوالے سے قانونِ فقہ میں دو اصول بیان کیے گئے ہیں۔ وہ یہ کہ اگر کوئی عمل سرزد ہو جائے اور اس عمل کے لیے قرآن و سنت میں نص صریح موجود نہ ہو تو پھر اس حکم کی تلاش کے لیے جو عمل کیا جاتا ہے، اس کو اجتہاد کہتے ہیں۔

اس اجتہاد کے تین حصے ہیں، پہلا حصہ قرآن و سنت کو ٹٹولنا ہے جس کو استقراء کہتے ہیں۔ اس تلاش کے نتیجے میں جو حکم کسی عالم کے ذہن و دل و دماغ پر وارد ہوتا ہے، اس کو استنباط کہتے ہیں، پھر اس حکم اور اس عمل کے درمیان ایک رشتہ اور رابطہ تلاش کیا جاتا ہے جس کو قیاس کہتے ہیں جبکہ اس مجموعی عمل کو اجتہاد کہتے ہیں۔ ایک اجتہاد کسی دوسرے اجتہاد کا راستہ نہیں روک سکتا۔ یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ میں اس حکم کی تلاش میں ہوں، آپ سب آرام کرو۔ اور نہ کوئی مجتہد اپنے اجتہاد کو دوسروں پر تحمیل کر سکتا ہے۔ دلیل کی بنیاد پر اگر کوئی اس کا قائل ہوگا تو ساتھ دے گا، قائل نہیں ہوگا تو ساتھ نہیں دے گا۔

دوسرا معاملہ جو انسان کو پیش ہو سکتا ہے، وہ یہ ہے کہ شریعت کا حکم بالکل واضح ہو۔ لیکن اس پر عمل کرنے میں وہ متحیر ہو، مثلاً نماز کے وقت قبلہ رُخ ہونا۔ یہ ایک واضح شرعی حکم ہے کہ یہ فرض ہے لیکن اگر چٹیل میدان میں چند لوگ ایسی حالت میں مبتلا ہو جائیں کہ ان کو قبلے کے رُخ کا پتہ نہ چلے تو اس کے لیے جو شرعی عمل ہے، وہ تحری ہے، یعنی ہر شخص یہ سوچے گا کہ قبلے کا رُخ کس طرف ہے۔ کوئی شخص یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں قبلہ کا رُخ متعین کر رہا ہوں اور آپ سب آرام کریں۔ ہر شخص پر اپنی اپنی دانش کے مطابق جہت کا تعین فرض ہے۔ اگر کوئی شخص کسی بھی جہت کے بارے میں

یہ سوچے کہ قبلہ اس رُخ ہوگا اور اس نے اپنی تعین کردہ جہت کو چھوڑ کر کسی اور طرف قبلہ رُخ ہو کر نماز پڑھی تو اس پر دوبارہ نماز پڑھنا واجب ہوگا کیونکہ اس وقت اس کا اسی جانب نماز پڑھنا واجب تھا جس طرف اس کو یقین ہوا تھا۔ لہٰذا نہ کوئی مجتہد اپنے اجتہاد کو تکمیل کر سکتا ہے، اور نہ کوئی متحری اپنے تجزیہ کو تحلیل کر سکتا ہے۔ جب یہ پتہ ہو تو پھر اجتہاد عمل کے لیے ہوگا اور اگر علم کو عمل کے لیے حاصل کیا جائے تو عمل کے میدان میں جھگڑا نہیں ہے۔ جھگڑا تکمیل میں آتا ہے، جب ہر عالم اپنے علم کو دوسروں پر مسلط کرنا چاہے، جو کہ علم اور نہ ہی مذہب کا تقاضا ہے۔ یہ اس اقتدار اور حکومت کی ضرورت ہوتی ہے جو عوام کے افکار و خیالات اور اخلاق کی ترجمانی نہ کرتی ہو۔ مذہبی فرقہ واریت سے مذہب، علماء اور مدارس کو منسوب کرنا درست نہیں ہے، یہ دراصل اقتدار کی مجبوری ہوتی ہے جہاں پر کوئی ہدف متعین نہ ہو۔ اب آپ ہی بتائیں کہ جب سے ہمارا ملک بنا ہے، اس میں کون سی چیز متعین ہے؟ اس میں یہ متعین ہے کہ اس ملک کا نظام اسلام ہوگا، جو آئین میں موجود ہے، مگر اس پر عمل نہیں ہو رہا۔ اس طرح یہ بھی متعین ہے کہ اس ملک کی قانون سازی کا ماخذ شریعت ہوگا، لیکن عمل نہیں ہو رہا۔ لہٰذا یہاں پر کسی متعین پر عمل موجود نہیں۔ آپ جو یہ دیکھتے ہیں کہ یہاں پر الیکشن ہوتے ہیں، وہ افراد کے چناؤ کے لیے نہیں بلکہ نظریات کے چناؤ کے لیے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر بعض جماعتیں کہتی ہیں کہ اسلام، بعض جماعتیں نیشنلزم اور بعض سوشلزم کا نعرہ لگاتی ہیں۔ یہ تو افکار ہیں، اشخاص نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس ملک میں افکار، اہداف، مقاصد، خیالات اور نظریات کا خلا ہے۔ اس لیے لوگ پھر ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے لیے دوڑ لگاتے ہیں۔ اس ملک میں یہ بھی متعین نہیں کہ اقتدار تک پہنچنے کا راستہ بندوق کی نالی ہے یا عوام کا ووٹ ہے۔

اس ملک میں 35 سال تک ایسی قوتوں نے حکومت کی ہے، جن کو کسی آئین کی ضرورت تھی اور نہ عوام کے اعتماد کی۔ اب موجودہ عہد میں آئین کی بات بھی کی جاتی ہے، قانون کی بات بھی ہوتی ہے اور ووٹ کی بات بھی ہوتی ہے۔ جس ملک میں اب تک یہ متعین نہیں کہ اقتدار میں آنے کا صحیح راستہ بندوق کی نالی ہے یا عوام کا اعتماد ہے تو آپ بتائیں کہ اندرونی و بیرونی روابط کا محوری نقطہ کیا ہوگا۔ اس ملک میں یہ بھی متعین نہیں کہ اس ملک کے مالک وہ لوگ ہیں جو ٹیکس دیتے ہیں یا وہ لوگ ہیں جو ان ٹیکسوں سے تنخواہ پاتے ہیں۔ اب جس ملک میں یہ بھی متعین نہ ہو کہ مالک کون ہے تو آپ بتائیں کہ بیرونی و اندرونی روابط کس بنیاد پر قائم ہوں گے؟ اس ملک میں یہ بھی واضح نہیں کہ جب اقتدار ہاتھ آئے تو استعمالِ اقتدار کا طریقہ کیا ہوگا۔ یہ بھی واضح نہیں ہو سکا کہ پارلیمنٹ کی مطلق اکثریت بغیر کسی قید و بند کے قانون سازی کا اختیار رکھے گی یا قرآن و حدیث کے دائرہ کے اندر قانون سازی کی جائے گی، اور جب استعمال اقتدار اور حصول اقتدار کا طریقہ ہی متعین نہیں تو کوئی نظام کیسے متعین ہو سکتا ہے۔ قانون کبھی کسی قوم کو ہدف نہ ہی منزل کے بارے میں بتاتا ہے بلکہ قانون اس لیے ہوتا ہے کہ رہنمائی کر سکے۔ نسلی وحدت سے قوم بنتی ہے اور فکری وحدت سے اُمت بنتی ہے۔ زندگی کے سفر کے راستے کی وحدت سے ملت بنتی ہے تو گویا قوم اور ملت پہلے ہوتی ہے اور ان کا مقصد، منزل اور راستہ متعین ہوتا ہے۔ قانون اس روڈ کی طرح ہے جو ایک نقطے سے دوسرے نقطے کو خطِ مستقیم پر ملائے۔ جب منزل اور راستہ متعین ہو تو قوم اپنی خواہش و مرضی سے متعین راستے کے ذریعے منزل تک سفر طے کرتی ہے۔ اگر کوئی ایک آدھ منحرف ہو تو پھر اس کو قانون کے ذریعے سے راہِ راست پر لایا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس ہمارے یہاں قانون منزل، مقصد اور راستہ بتانے کے لیے استعمال ہوتا ہے، جو کہ اس کا غلط استعمال ہے۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ پہلے پاکستان کی عوام کو کسی ایک نقطے پر متفق کرنے کی ضرورت ہے۔ جیسا کہ مغرب کی دنیا مادے پر متفق ہے کہ ہم مادی زندگی چاہتے ہیں۔ چنانچہ ان کا راستہ متعین ہے۔ کوئی اس کو انسانی زندگی کہے یا نہ کہے لیکن جب ہم مادے کی طرف دیکھتے ہیں تو ہم اس کی جانب راغب ہو جاتے ہیں۔ جب آخرت یاد آتی ہے تو پھر اس جانب متوجہ ہوتے ہیں۔ نہ کوئی منزل ہے اور نہ کوئی مقصد اور نہ ہی قانون کا صحیح استعمال، اس خلا کو کیسے پر کیا جائے؟ میں تو کہتا ہوں کہ پاکستان صرف نام کا ملک ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ کشمیر پاکستان کی حد سے باہر ہے یا اندر؟ اگر باہر ہے تو ہمارا اس سے کیا واسطہ؟ اگر اندر ہے تو ہندوستان کا کیا واسطہ؟ آپ نقشہ اٹھا کر دیکھیں تو آپ نہ اس کو اندر کہہ سکتے ہیں نہ باہر اور

ایک جھگڑا ہے جو دونوں ممالک کے درمیان مسلسل چل رہا ہے جس کا کوئی حل نہیں۔ اسی طرح میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان بنیادی طور پر اس لیے بنا تھا کہ مسلم اکثریت اسلامی نظام کے ثمرات سے مستفید نہ ہو سکے اور اسٹیبلشمنٹ اس کی حاکم رہے، اور یہ خطہ بطور جاگیر ان کی حاکمیت میں رہے۔ یہاں پارلیمنٹ کہتی ہے کہ یہ اس کا اختیار نہیں ہے۔ یہ اختیار اُس سے کس نے چھینا؟ اس لیے کہ یہ سارے کے سارے مزارع ہیں اور اسٹیبلشمنٹ جاگیردار ہے۔ جاگیردار مزارعوں سے زیادہ کام لیتا ہے اور انہیں سہولیات کم دیتا ہے۔ اگر آپ نے صحیح معنوں میں اس ملک اور اس اُمت کی خدمت کرنی ہے تو سیاست دان، علماء اور حکمران اہداف متعین کریں اور تھنک ٹینک یا سوچنے والے ادارے عوام کو صحیح خطوط پر لائیں۔

پھر جب سوویت یونین افغانستان میں آیا، اس نے شکست کھائی اور ٹوٹ بھی گیا۔ اقوام متحدہ کا نمائندہ کابل میں بیٹھا ہے اور مجاہدین کو دعوت دیتا ہے کہ آؤ میں تمہیں حکومت بنا کر دوں، وہ انکار کرتے ہیں کہ ہم نے قربانیاں اس لیے تو نہیں دی تھیں کہ قیادت کا خلا ہو جائے اور پھر اس خلا کو آپ پُر کریں۔ چنانچہ امریکہ یہاں سے چلا گیا اور مجاہدین آپس میں الجھ گئے۔ لیکن امریکہ ان خدشات کا شکار بھی تھا کہ اگر مجاہدین کو کبھی محسوس ہوا کہ ہم اس خلا کو پُر کرنے میں دلچسپی رکھتے ہیں تو پھر ان کی ساری توجہ امریکہ کی جانب مبذول ہو جائے گا، بالکل ایسے ہی جیسا کہ کتے آپس میں تو لڑتے ہیں لیکن بھیڑیے کو دیکھ کر سب لڑائی چھوڑ کر اس کے گلے پڑ جاتے ہیں۔ امریکہ کا یہ خیال بھی تھا کہ ان حالات میں ان مجاہدین کو بین الاقوامی حمایت بھی حاصل ہو جائے گی، اور امریکہ کا وہی حشر ہوگا جو سوویت یونین کا ہوا۔ چنانچہ امریکی خفیہ اداروں نے ایک منصوبہ تیار کیا اور مجاہدین کو ایک صف میں کھڑا کر دیا جبکہ مدرسے کے نوخیز طالب علموں کو دوسری صف میں، جن میں جذبہ ہے لیکن انہیں تجربہ کوئی نہیں ہے اور ان دونوں کو ایک دوسرے سے لڑوانے کا منصوبہ بنایا۔ امریکہ سمجھتا تھا کہ اس طرح مجاہدین اس کے تابع ہوں گے، جب ہم انہیں لڑائیں گے تو وہ لڑیں گے اور مدارس کے ان طلباء کو جہادی صف میں شامل کرنے کا نقصان بھی مذہب کو ہوگا اور بدنام بھی مذہب ہوگا اور امریکہ کا افغانستان میں آنے کا راستہ کُھل جائے گا۔

کسی حکومت یا سیاست دان نے یہ سوچا کہ ہم یہ کیا کر رہے ہیں اور یہ تمام خرابیاں ان حکومتوں کی وجہ سے آئی ہیں جنہیں نہ کسی آئین کی ضرورت تھی اور نہ عوام کے ووٹ اور اعتماد کی۔ مگر ہمارے علماء نے بھی آنکھیں بند کر کے ان کا ساتھ دیا۔ اور جب امریکہ کی فوجیں افغانستان میں داخل ہو گئیں تو علماء نے افغانستان کے دورے بھی چھوڑ دیے اور طالبان بھیجنا بھی بند کر دیئے۔ اُمت کی اس تباہی میں ہم سب شریک ہیں۔ حکومت، علماء اور سیاست دان کوئی بھی بری الذمہ نہیں ہے، اگر ہم سر جوڑ کر آپس میں بیٹھیں اور اس اُمت پر علماء، اسٹیبلشمنٹ، سیاست دان اور حکومت رحم کرے تو مشکل نیست کہ آساں نشود۔۔۔ ردِ باید کہ ہر آساں نشود۔

حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ جب بھی تم کوئی کام شروع کرو تو آسان ترین نقطے سے شروع کرو۔ ہمارے لوگوں میں اللہ نے صلاحیت رکھی ہے اور ہر طبقے میں ایک صلاحیت موجود ہے۔ اگر خود غرضی اور انانیت سے بالاتر ہو کر سنجیدگی سے سوچیں تو ایک ایسا آسان ترین نقطہ ہمیں مل سکتا ہے، جو وحدت کا باعث بنے اور آزادی کی نوید بھی لائے۔

پُرامن اور متوازن معاشرے کے خدوخال

(پہلی نشست)

صدارت: مولانا محمد حنیف جالندھری
سیکرٹری جنرل وفاق المدارس العربیہ و پرنسپل جامعہ خیر المدارس، ملتان
مقررین؛
ڈاکٹر فرید احمد پراچہ، مرکزی رہنما جماعتِ اسلامی و ڈائریکٹر علماء اکادمی منصورہ، لاہور
ڈاکٹر سید محمد نجفی، پروفیسر و منتظم جامعۃ المنتظر، رہنما وفاق المدارس الشیعہ
مولانا عطاء اللہ شہاب، رُکن گلگت بلتستان کونسل و پرنسپل دارالعلوم گلگت
ڈاکٹر خالد ظہیر، تنظیم المورد، لاہور

عالمی و علاقائی تناظر؛ ڈاکٹر فرید احمد پراچہ

جہاں تک پُرامن اور متوازن معاشرے کے خدوخال کا تعلق ہے تو یہ قرآن پاک اور حدیث میں بڑے واضح ہیں۔ اور اگر ہم اسے پائیدار امن اور متوازن معاشرے کے نقطۂ نظر سے دیکھیں تو وہ صرف اسلامی نظام کے ذریعے سے ہی قائم ہوسکتا ہے۔ اور ایک ایسا معاشرہ جس کی بنیاد توحید و رسالت ﷺ اور آخرت کے حقائق پر رکھی جائے اور جس کے اہداف کے اندر امر بالمعروف و نہی عن المنکر، تزکیہ نفس، رضائے الٰہی، طہارتِ قلب اور فلاح اخروی شامل ہوں اور جو وحدت فکر انسانی اور وحدتِ نسل انسانی اور معاشرتی مساوات کی بنیاد پر قائم ہو اور معاشرتی مساوات کو نظام عبادات کا حصہ بنا دیا جائے اور ایک ایسا معاشرہ جو اخوت، یعنی ''انما المؤمنون اخوۃ'' اور ''واعتصموا بحبل اللہ جمیعا'' کی بنیاد پر بنے، اس سے زیادہ متوازن اور پُرامن معاشرہ کوئی اور نہیں ہوسکتا لیکن اس وقت ہم ایک خاص صورت حال سے دوچار ہیں جس کی وجہ سے ہم آج متفکر ہو کر بیٹھے ہیں۔ پاکستان حالت جنگ میں ہے اور 31 ہزار بے گناہ لوگ مارے جا چکے ہیں، اسی طرح سے ہمارا 68 ارب ڈالرز کا نقصان ہو چکا ہے اور کوئی دن ایسا نہیں جب لاشیں نہ اٹھائی گئی ہوں۔ دنیا میں سب سے زیادہ بے گھر افراد کی تعداد بھی پاکستان میں ہے۔

اس ساری صورتحال جس سے پاکستان 9/11 کے واقعات سے گزر رہا ہے اور جس طرح سے نیٹو فورسز افغانستان میں اتری ہیں، اس کے بعد سے جو پاکستان میں امن و امان کے حالات بنے ہیں، اس میں ہم دو عالمی قوتوں اور ایک علاقائی قوت کے کردار کو کسی صورت بھی نظر انداز نہیں کر سکتے۔ ان دو عالمی قوتوں میں ایک امریکہ اور دوسری اسرائیل ہے اور علاقائی قوت بھارت ہے۔ ان عالمی قوتوں کے ایجنڈے بڑے واضح ہیں۔ اگر یہود اور اسرائیل کے بارے میں کہا جائے تو 1896ء کے یہودیوں کے پروٹوکول میں دنیا بھر کے میڈیا اور سرمایہ کاری پر قابض ہونا اور ایک ایسی ریاست کا قیام جو نیل اور فرات کو بھی اپنے دامن میں لے لے، ان کے مقاصد میں شامل ہے اور یہ ساری صورتحال اسی کا تسلسل ہے۔ پاکستان کی ایٹمی قوت انہیں کسی طرح سے بھی ہضم نہیں ہوتی۔ دوسری بڑی قوت امریکہ ہے، اس کو ہم مغرب کہیں تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ نبی کریم ﷺ

نے فرمایا کہ ''پارس کے ساتھ تمہاری ایک ٹکر ہوگی اور اللہ تعالیٰ تمہیں فتح عطا فرمائے گا لیکن روم کے ساتھ تمہاری جنگیں ہوتی رہیں گی۔ ان کا ایک سینگ ٹوٹے گا تو دوسرا سامنے آجائے گا۔'' گزشتہ 14 سو سال سے ہم مغرب کے ساتھ لڑ رہے ہیں، لڑائی کا یہ پہلو قابل ذکر ہے کہ اس کا آغاز 9/11 سے نہیں ہوا، جیسا کہ آج بیان کیا جاتا ہے۔ اس کا آغاز 90ء سے ہوا جب 89ء میں روس کی فوجیں افغانستان میں شکست کھا گئیں۔ اس کے فوری بعد ایک جنگ کا اعلان کر دیا گیا اور نیٹو کے سیکرٹری جنرل کا بیان ہے کہ پہلے دنیا کو سرخ خطرہ تھا اور اب سبز خطرہ ہے۔ رچرڈ منسن نے بھی کہا کہ جہادی اسلام دنیا کے لیے خطرہ بن گیا ہے اور اس طرح یہ وہی دور ہے جب فوکویاما کی کتاب End of History اور سیموئیل ہنٹنگٹن کی کتاب Clash of Civlizations کے ذریعے باقاعدہ تہذیبوں کا تصادم شروع کیا گیا۔ توہین آمیز خاکے اور قرآن پاک کی توہین اسی کا حصہ ہیں۔ عسکری یلغار، پاکستان کی ایٹمی قوت کو غیر مؤثر کر دینا، تیل کے وسائل پر قبضہ کرنا اور دنیا بھر میں اپنے آپ کو سپر پاور کے طور پر منوانا اس سلسلے کی کڑیاں ہیں۔ اس کھیل کا ایک اہم کھلاڑی بھارت بھی ہے جس نے کبھی پاکستان کو دل سے تسلیم نہیں کیا۔ کشمیر پر اس کا قبضہ ہے۔ اسی طرح اس نے ہمارے پانیوں پر 62 ڈیم بنا دیئے ہیں اور پاکستان کے اندر تخریب کاری اور سمجھوتہ ایکسپریس کے واقعات سے واضح ہو گیا ہے کہ اس میں بھارتی فوج ملوث ہے، اور یہ دنیا کی واحد فوج ہے جو تخریب کاری کا پلان دوسرے ممالک کے اندر بناتی ہے۔ چونکہ ہم اپنے کیس کو دنیا کے سامنے نہیں پیش کر سکے، اس لیے آج ہم ملزموں کے کٹہرے میں کھڑے ہیں۔ بھارت کی طرف سے جو یلغار کی گئی ہے، اس کے بڑے شواہد موجود ہیں۔ اہم پہلو یہ ہے کہ عالمِ اسلام کے مسائل جن میں فلسطین، کشمیر، فلپائن اور چیچنیا شامل ہیں، ان کے حل کی طرف نہ مسلمانوں کے اپنے حکمرانوں کی کوئی توجہ ہے، نہ OIC کی، نہ اقوام متحدہ کی اور نہ دنیا کی نام نہاد سپر پاور کی۔ اور انسانی حقوق کے جو بنیادی مسائل ہیں، جن پر اقوام متحدہ کی قراردادیں بھی موجود ہیں، ان میں موجود جمہوریت کے تمام اصولوں کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ اور جب بھی ان مختلف خطوں میں آزادی کی تحریکیں اٹھتی ہیں تو پھر ان کو دہشت گردی کی تحریکیں قرار دے دیا جاتا ہے۔ گویا کہ یہ ثبوت دیا جاتا ہے کہ مسلمانوں کی نہ 'بُلٹ' کا فیصلہ قبول ہے اور نہ ہی 'بیلٹ' کا۔ حماس نے انتخابات میں حصہ لیا، لیکن ان کے اقتدار کو قبول نہیں کیا گیا۔

تیسرا اس کا پہلو یہ ہے کہ ہم اپنے ملک کے اندر مذہبی انتہا پسندی کی بہت بات کرتے ہیں، یہ کسی بھی درجے میں نہیں ہونی چاہیے، لیکن اس کے ساتھ ہی پاکستان میں سیکولرازم مسلسل بڑھ رہا ہے اور یہ پاکستان کے آئین اور اسلامی شناخت کے بالکل منافی ہے، اس پر کوئی بات نہیں کی جاتی۔ جب سیکولرزم یا لادینیت کی بات کی جائے اور مذہبی شعائر کا مذاق اڑایا جائے تو اس سے بھی صورتحال پیچیدہ ہوتی ہے۔ اسی صورتحال کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جو لوگ اس تخریب کاری میں شامل ہیں، ان کے تربیتی کیمپ افغانستان میں قائم ہیں اور انہی کے اندر بلیک واٹر کے ایجنٹ بھی موجود ہیں۔ ریمنڈ ڈیوس کا واقعہ یہ واضح کرتا ہے۔ ان لوگوں کے مکانات اور گاڑیوں کے نمبر تک میڈیا میں آچکے ہیں۔ ان کے اہلکار ناکوں پر پکڑے جاتے ہیں، لیکن ان کو چھوڑ دیا جاتا ہے۔ نیول ہیڈ کوارٹر کے اندر بھی ان کے 6 افراد موجود تھے۔ گویا اب اس حوالے سے واضح شواہد کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ خود یہ بتاتے ہیں کہ ہمارے اتنے اہلکار پاکستان میں ہیں۔

دوسری طرف ڈرون حملوں میں بے گناہ لوگ مارے جاتے ہیں، اور پھر ڈرون حملوں کے ردعمل کو بھی یہی لوگ اپنے مفادات کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ میں اس صورتحال میں کسی کو بری الذمہ قرار نہیں دیتا۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دہشت گردی میں استعمال ہونے والے بھی شریکِ جرم ہیں۔ دارالحرب کی بحث ہو یا خروج کی یا خودکش حملوں کے بارے میں تکفیری معاملہ، یہ سارے عوامل پاکستان میں حالات خراب کرنے کے لیے استعمال کیے جاتے ہیں۔ خاص طور پر ان کا مقصد فرقہ واریت پیدا کرنا ہے۔ پاکستان میں فرقہ واریت موجود نہیں ہے، بلکہ پیدا کی جا رہی ہے۔ اس لیے یہاں دونوں طرف سے حملے کیے جاتے ہیں اور یہ انہی عالمی اہداف کا حصہ ہے۔ اس طرح پاکستان کے عسکری مراکز جی ایچ کیو، نیول بیس پر حملہ اور پاکستان کے دوست ممالک چین اور سری لنکا کے شہریوں کو ہدف بنانا اور عام لوگوں میں دہشت گردی کرنا، تاکہ پاکستان کے

خطے کو ایک غیر محفوظ ملک قرار دیا جائے اور اقوام متحدہ کی پاکستان کے ایٹمی اثاثوں پر نگرانی کے عمل کو یقینی بنایا جائے۔ ان سارے معاملات کو پرویز مشرف کے لال مسجد آپریشن اور جہادی تنظیموں پر پابندیوں جیسے اقدامات نے تقویت دی ہے۔

ان حالات میں علمائے کرام پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ عالمی تناظر کو مدِ نظر رکھتے ہوئے یہ ادراک کریں کہ منبر و محراب ایک بڑی قوت ہے، جو کہ میڈیا سے بھی بڑی قوت ہے، اگرچہ میڈیا بلاشبہ بڑا اچھا کردار ادا کر رہا ہے۔ علمائے کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ منبر و محراب کے ذریعے انسانی جان کی حرمت کا احساس پیدا کریں۔ مثال کے طور پر کراچی میں رینجرز اہلکاروں کی ہلاکت سے نوجوان کی ہلاکت کا واقعہ ہو یا خروٹ آباد کا، ان سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی جان کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی ہے۔ اسی طرح حقوق العباد کے تصور، اتحاد امت اور جذبہ جہاد کو منبر و محراب کے ذریعے اجاگر کیا جائے۔ آج جہاد کے خلاف ایک فضاء قائم کی جا رہی ہے، حالانکہ آج ہم تشویشناک حالات سے دوچار ہیں اور انڈیا، امریکہ اور اسرائیل ہمارے دشمن ہیں۔ اور یہ جذبہ جہاد ہی ہے جو امت کو صحیح طور پر تربیت دے سکتا ہے۔ لہٰذا جہاد کے مسئلہ کو درست طور پر بیان کیا جائے اور اس کو معدوم نہ ہونے دیا جائے۔ پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام ضروری ہے۔ علمائے کرام کو اپنی قوت ملک میں قرآن و سنت کی بالادستی قائم کرنے کے لیے خرچ کرنی چاہیے جو پاکستان کے آئین کا تقاضا ہے اور تب ہی ایک پرامن اور متوازن معاشرہ قائم ہو سکتا ہے۔ اس طرح دارالحرب اور دیگر مسائل پر علمائے کرام کو رہنمائی کرنی چاہیے، تاکہ معاملات الجھے نہ رہیں اور بالکل واضح طور پر اتفاق رائے سے چیزیں سامنے آئیں۔ یہ بات مغرب تک پہنچا دینی چاہیے کہ افغانستان سے امریکہ اور نیٹو فورسز کے انخلا، مسلمانوں کے جذبات کو مجروح کرنے والے واقعات، ظلم اور عالم اسلام کے مسائل، جیسا کشمیر اور فلسطین کا مسئلہ ہے، ان کو حل کیے بغیر دنیا کے اندر پائیدار امن قائم نہیں ہو سکتا۔

سماجی و معاشی تناظر؛ ڈاکٹر سید محمد نجفی

ہمارا موضوع ہے پُرامن اور متوازن معاشرے کے خدوحال۔ اس موضوع کو اگر ہم مدنظر رکھیں تو اللہ تعالیٰ نے تمام مخلوقات میں باعظمت مخلوق انسان کو پیدا کیا ہے۔ ربِ کائنات نے ''تبارک اللہ اُحسن الخالقین'' کے الفاظ انسان کے لیے استعمال کیے ہیں۔ اسی فضیلت کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے انسان کی سرشت میں اپنے حقوق اور اپنی ذمہ داریاں رکھی ہیں اور وہ خود ان حقوق کا مطالبہ بھی کرتا ہے اور ان کی خواہش بھی رکھتا ہے۔ اس کا یہ حق ہے کہ اسے پرامن اور متوازن معاشرہ ملے، انسان کا یہ حق اس کی سرشت میں شامل ہے، وہ اسے دیا نہیں جاتا بلکہ اسے فطرتاً ودیعت کیا گیا ہے۔ بعدازاں کچھ ایسے ادارے بنے، جنہوں نے انسانوں کے حقوق کے لیے کام کیا۔ ان حقوق کے لیے جو موضوع ہم نے منتخب کیا ہے، بنیادی طور پر اس پر تین حوالوں سے بات کی جا سکتی ہے۔

پُرامن معاشرہ جیسا ہمیں قرآن پاک نے بتایا اور جیسا کہ ہمیں حضورﷺ، صحابہ کرام اور معصومین نے بتایا ہے، وہ معاشرہ کیسا ہے اور اس کے خدوخال کیا ہیں؟ اس بارے میں ہمیں پتہ ہونا چاہیے۔ دوسری گفتگو یہ ہو سکتی ہے کہ ہم جس مقام پر کھڑے ہیں، کیا ہم پُرامن اور متوازن معاشرے کے مطابق زندگی بسر کر رہے ہیں۔ کیا معاشرے کی جو شرائط، حضورﷺ، صحابۂ کرام اور بزرگان دین نے بتائیں ہیں، ہم ان کے مطابق چل رہے ہیں۔ اور تیسرا یہ کہ جس سمت میں ہم چل رہے ہیں، اس میں ہم اگر تبدیلی لانا چاہیں تو کیسے لا سکتے ہیں۔ میں نے اس کے لیے صرف دو خطبات دیکھے ہیں۔ ''نہج البلاغہ'' میں امیر المومنین حضرت علیؑ کے ان خطبات کو محور بنا کر میں صرف چند باتیں کروں گا۔ نہج البلاغہ کے خط نمبر 53 اور خطبہ نمبر 216 سے پتا چلتا ہے کہ متوازن معاشرے کے خدوخال کیسے ہونے چاہئیں اور یہ کہ پرامن معاشرہ کسے کہتے ہیں؟ میں صرف تین عنوانات بیان کروں گا۔

پرامن معاشرے کے لیے مساوات کا ہونا بہت ضروری ہے، اور یہ مساوات کا بیان بڑا بلیغ ہے۔ امیر المومنینؓ نے اس مساوات میں صرف مسلمانوں کو مدِ نظر نہیں رکھا اور نہ ہی یہ مدِ نظر رکھا کہ یہ کس دور کا مسلمان ہے۔ ان کی نظر میں مسلمان سے مراد ایک پورا انسان ہے، یعنی انسانیت کی مساوات۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں؛ ''لوگ جو تجھ جیسے ہیں یا تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں یا دینی بھائی نہیں، لیکن کم از کم انسان ضرور ہیں۔'' لہٰذا مساوات کو ہم ذیلی طور پر پانچ حصوں میں تقسیم کرتے ہیں۔

(1) حق میں مساوات ہونی چاہیے۔ یہ نہیں کہ کوئی شخص حکومت سے تعلق رکھتا ہے یا کسی پارٹی سے تعلق رکھتا ہے تو اس کا حق زیادہ ہے۔ جب تک حق کے اندر مساوات نہیں ہے، اس وقت تک معاشرے میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔ جیسا کہ امیر المومنینؓ نے فرمایا؛ تمام لوگ حق کے حوالے سے برابر ہیں۔

(2) قانون میں مساوات ہونی چاہیے۔ اس کی ہر شق میں ہمیں مساوات کو مدِ نظر رکھنا ہوگا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم اللہ کی کتاب اور سیرت رسول ﷺ کا مطالعہ کریں۔

(3) بیت المال میں مساوات ہونی چاہیے۔ بیت المال کا تصور جو اس دور میں موجود تھا، وہ آج کی ضرورت ہے۔ آج ہم جو تصور دیکھتے ہیں کہ زکوٰۃ غریبوں سے لی جاتی ہے اور امیروں میں بانٹ دی جاتی ہے۔ ٹیکس غریبوں سے لیا جاتا ہے اور کھا امیر جاتے ہیں۔ اس طرح کا معاملہ نہیں ہونا چاہیے۔

(4) برتاؤ اور رویوں میں مساوات پیدا کرنی ہوگی۔ حضرت علیؓ کا فرمان ہے کہ ''اپنے پَر ان کے لیے بچھا دیجئے''۔ امیر المومنینؓ نے جب حضرت ابوبکرؓ کے فرزند محمد بن ابوبکرؓ کو مصر بھیجا تو اس وقت آپؓ نے انہیں تین باتیں بتائیں؛ ''تیرے دروازے ان کے لیے ہر وقت کھلے ہونے چاہئیں۔ ہر وقت تمہارے پران کے لیے بچھے ہونے چاہئیں، تاکہ لوگ کسی بھی وقت تجھ سے رجوع کرسکیں۔ تیرے اندر اتنی نرمی ہونی چاہیے کہ ہر شخص تیری طرف کھنچا چلا آئے۔ تیری پیشانی ہمیشہ کشادہ ہونی چاہیے۔'' یہ تینوں نکات برتاؤ کے حوالے سے ہیں، یعنی اگر ہماری پیشانیاں کشادہ ہوں گی اور ہم نرم خو ہوں گے تو نہ کوئی فرقہ واریت ہوگی اور نہ کوئی تعصب۔ اصل مسئلہ تب پیدا ہوتا ہے، جب ظاہری طور پر ہماری پیشانی کشادہ ہوتی ہے لیکن عملی طور پر کشادہ نظر نہیں آتی۔ قرآن کے حوالے سے تو ہم متفق نظر آتے ہیں مگر جب قرآن سے باہر آتے ہیں تو کوئی شیعہ بن جاتا ہے، کوئی بریلوی اور کوئی دیوبندی۔

(5) جنسیت میں مساوات ہونی ہے۔ عورت اور مرد دونوں کے لیے برابر حقوق ہیں، یعنی اگر ہم پُرامن اور متوازن معاشرہ دیکھنا چاہتے ہیں تو ہمیں جنسیت میں مساوات کی ضرورت بھی ہے۔

دوسرا نقطہ آزادی کے حوالے سے ہے جس پر بہت زیادہ گفتگو کی جاتی ہے۔ آزادی کے بنیادی طور پر چار عنوان ہیں۔

عقیدے میں آزادی؛ یعنی آدمی جو عقیدہ رکھنا چاہتا ہے، اسے اس میں آزادی ہونی چاہیے۔ دوسرا، اپنے عقائد کو بیان کرنے کی آزادی ہونی چاہیے اور عقیدہ کے متعلق تحقیق کرنے میں آسانی ہونی چاہیے۔ اس کے بارے میں ہمارے پاس خوارج کی مثال موجود ہے، جو سب سے بدترین اور ملعون قوم تھی، اس کے باوجود حضرتؓ نے کبھی کسی پر پابندی نہیں لگائی اور نہ ہی کسی کو کبھی قید و بند میں رکھا۔ البتہ ان میں سے اگر کوئی ایسے جرائم میں ملوث ہوتا جن پر سزا مقرر کی گئی ہے تو ان کو بھی اسی طرح سزا ملتی، جیسا کہ دوسرے مسلمانوں کو ملتی۔ تیسرا، آزادیٔ بیانِ قلم ہے۔ خط نمبر 53 اور خطبہ نمبر 216 میں حضرت علیؓ کا بیان ہے ''حاکم آزادی بیان کی اہمیت بیان کرے اور لوگوں کی بات سننے کے لیے وقت نکالے۔ حاکم عوام کا بیان سننے کے لیے عوامی مقامات پر نظر آئیں۔'' چوتھی یا آخری چیز جو آج کل کے دور میں بہت اہم ہے، وہ میڈیا کا کردار اور آزادی ہے۔ اگرچہ میڈیا اس وقت موجود نہیں تھا لیکن حضرت علیؓ نے اشاروں کنایوں میں اس پر کچھ اس طرح روشنی ڈالی ہے کہ آپ حیران ہوں گے۔ مثلاً میڈیا کی

ذمہ داری ہے کہ مثبت چیزوں کو رواج دیں، اور یہ کہ منفی چیزوں کو رواج نہ دیں۔ ان کی ذمہ داری ہے کہ مشکلات کو دور کرنے کے لیے حکومت کو مفید مشورے دیں۔ میڈیا کی ذمہ داری ہے کہ خود محوری کی نفی کریں، اور خود کو عقلِ کل نہ سمجھیں۔ عوام میں اور حکومت کے درمیان رابطے کا کردار ادا کریں۔ تخریبی امور کی وضاحت اور نفی میڈیا کا کام ہے۔ علم کی ترقی، لوگوں کی خواہشات، مشوروں اور تنقید کو حکومت تک پہنچانا میڈیا کا کام ہے۔ اگر ہم اس طرح کی آزادی لے آئیں تو ہمارا معاشرہ پرامن اور متوازن رہے گا۔

آخری موضوع امن وامان ہے۔ امن وامان کا یہ مطلب نہیں کہ دہشت گردی کے مقابلے میں امن آجائے۔ یہ بڑا وسیع موضوع ہے، مثلاً ہر چیز میں امن وامان کی ضرورت ہے، جیسا کہ جان اور حیثیت میں امن وامان۔ صرف یہ نہیں کہ جان محفوظ ہے بلکہ متوازن معاشرے میں فرد کی سماجی حیثیت بھی محفوظ رہنی چاہیے۔ اس کے بعد مالی واقتصادی امن بھی برقرار رہنا چاہیے۔ مالی اور اقتصادی طور پر اتنا امن قائم ہو جائے کہ لوگ یہاں آکر کام کریں، نہ کہ یہاں سے بھاگ جائیں۔ آج ہمارے ملک کو ترقی کی ضرورت ہے، جس کے لیے مالی واقتصادی امن کا قیام ناگزیر ہے۔

عدل وانصاف کا امن بھی ہونا چاہیے۔ عدلیہ نہ صرف آزاد ہو بلکہ انصاف بھی فراہم کرے۔ اس طرح کا معاملہ نہ ہو کہ عدلیہ بعض معاملات بہت اچھے طریقے سے انجام دے اور بعض پر توجہ ہی مرکوز نہ کرے۔ جن معاملات کا تعلق دہشت گردی سے ہے، ان پر عدلیہ کو خاص طور پر توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ عدلیہ بیٹھی ڈھونڈ رہی ہوتی ہے کہ گواہ نہیں ہے۔ اس طرح کے معاملات میں حکومت کو خود مدعی بننا چاہیے، نہ کہ وہ گواہ ڈھونڈتی پھرے۔

اس کے علاوہ امیر المومنینؓ نے مسلمانوں کو تجسس سے باز رہنے کی تلقین کی ہے، یعنی کسی کا تعاقب نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کہاں جا رہا ہے اور کیا کر رہا ہے اور نہ ہی کسی کا فون ٹیپ کرنا چاہیے۔ امیر المومنینؓ فرماتے ہیں کہ اگر آپ چاہتے ہیں کہ آپ کا معاشرہ پرامن اور متوازن بن جائے تو امن کی ان تمام صورتوں کا ہونا ضروری ہے۔ آخری بات یہ کہ پرامن معاشرے کے قیام کے لیے سب کا تعلیم یافتہ ہونا ضروری ہے۔ جب تک ہم لوگوں کو تعلیم نہیں دیں گے، تب تک ہمارا معاشرہ پرامن اور متوازن نہیں بن سکتا۔

فرقہ ورانہ ہم آہنگی؛ مولانا عطاء اللہ شہاب

ارشادِ باری تعالیٰ ہے ''تم سب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو اور تفرقے میں مت پڑو۔'' نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ ''مومنین ایک جسم کی طرح ہیں، اگر اس کی ایک آنکھ دکھتی ہے تو اس کا پورا جسم دکھتا ہے۔''

پرامن اور متوازن معاشرے کے قیام میں علماء کے کردار کے موضوع پر منعقدہ دو روزہ سیمینار میں متوازن معاشرے کے خدوخال کے عنوان سے گفتگو کرنے کا حکم ملا ہے۔ فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تناظر پر بات کرتے ہوئے میری یہ کوشش ہوگی کہ موضوع سے متعلق چند باتیں اور فرقہ ورانہ ہم آہنگی کو فروغ دینے کے لیے چند تجاویز پیش کر سکوں۔ ہم اور آپ جس ریاست کے شہری ہیں، اس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہے۔ چونکہ کسی بھی ریاست میں یا کسی بھی ملک میں وحدت کی دو صورتیں ہوتی ہیں یا تو اس ریاست میں مذہبی وحدت ہو یا پھر سیاسی یا نسلی وحدت۔ جہاں پر مذہبی وحدت ہوگی وہاں پر فرقہ واریت پیدا نہیں ہوگی بلکہ اس سے جنم لینے والے خدشات اور تصادم کی صورتیں بھی پیدا نہیں ہوں گی جن سے آج ہم اور آپ دوچار ہیں۔ قومی اور نسلی وحدت کی صورت میں سیاسی اور نسلی انتشار پیدا نہیں ہوتا۔ ہماری بدقسمتی یہ ہے کہ پاکستان میں نہ مذہبی وحدت ہے اور نہ ہی قومی ونسلی وحدت۔ جس موضوع پر میں نے بات کرنی ہے، وہ مذہبی وحدت کے تناظر میں ہے لیکن اگر اس کے ساتھ ساتھ

سیاسی اور نسلی وحدت کو بھی ضمناً زیر بحث لایا جائے، تو یقیناً اس سے موضوع واضح کرنے میں مدد ملے گی۔

پاکستان میں آج مذہب کے نام پر جو انتشار موجود ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ مذہبی طبقات بدنام ہو رہے ہیں بلکہ مذہب بیزار ماحول کو فروغ مل رہا ہے۔ جب تنازعات اور جھگڑے جنم لیتے ہیں اور یہ جھگڑے اور تنازعات گفتگو اور مکالمات سے ہٹ کر ایک دوسرے کے مقابل آجاتے ہیں تو اس کے نتیجے میں عوامی اور معاشرتی سطح پر جو کلچر پیدا ہوتا ہے، وہ مذہبی بیزاری کا ہوتا ہے۔ اگر اس کے مقابلے میں سیاسی وحدت قائم ہوتی تو پھر مذہبی وحدت کی عدم موجودگی پر بھی پردہ پڑتا۔ افسوس صد افسوس کہ اس ملک میں جتنا انتشار مذہب کے عنوان سے ہے، اس سے زیادہ سیاسی اور قومی تعصب کے عنوان سے ہے۔ پاکستان کے قیام کا مقصد اور اس کے جو محرکات ہیں، اگر ان پر نظر ڈالی جائے تو پاکستان کے مطلب لا الٰہ الا اللہ سے یہ مقصد واضح ہوتا ہے اور عملاً صورت حال یہ ہے کہ دل و دماغ کی غلامی جو ہم نے انگریز سے مستعار لی تھی، آج وہ اتنی طاقتور ہو چکی ہے کہ اس کے سامنے تمام ادارے بے بس ہیں، بلکہ اس موقع پر یہ کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا کہ

وطن تو آزاد ہو چکا دماغ و دل غلام ہیں اب بھی
مئے غفلت پئے ہوئے ہیں یہاں کے خاص و عام اب بھی
غلط ہے ساقی تیرا یہ نعرہ بدل گیا نظامِ محفل
وہی شکستہ سی بوتلیں ہیں اور پرانے سے جام اب بھی
میرے میخانۂ وطن کا رنگ ہی کچھ عجیب ہے
کس کو جامِ شراب جائز اور کسی پر پانی حرام اب بھی

محترم علمائے کرام!

فرقہ واریت کے نقصانات اتنے عیاں ہو چکے ہیں کہ کسی کو فرقہ واریت کے نقصانات سمجھانے کے لیے کسی قسم کے لیکچر، کتاب یا کسی تحریر کی ضرورت نہیں رہی لیکن یہ سوال موجود ہے کہ اگر اتنے نقصانات ہو رہے ہیں تو کیا اس کے حل کے لیے کوششیں ہوئی ہیں یا نہیں؟ اگر ہوئی ہیں تو وہ دیرپا کیوں نہیں رہیں؟ بہرحال ایک خوش آئند پہلو یہ ہے کہ 14 اگست 1947ء سے لے کر اب تک ان 65,64 سالوں میں موقع بر موقع ایسے واقعات و مثالیں قائم ہوتی رہی ہیں ہیں جو فرقہ وارانہ ہم آہنگی، مذہبی رواداری اور مسلکی تحمل و برداشت کے حوالے سے عمدہ مثال کے طور پر پیش کی جاسکتی ہیں۔ جب قیام پاکستان کے لیے کوششیں ہو رہی تھی تو اس وقت سب کے سب مسلمان ایک جذبے سے سرشار تھے۔ وہ ہی جذبہ محرکہ قیام پاکستان کا باعث بنا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ تمام طبقات، تمام مسالک اور فرقوں نے اپنے اپنے نظریات اور عقائد پر قائم رہتے ہوئے قیام پاکستان کے لیے بھرپور کوششیں کیں۔ قیامِ پاکستان کے 5 سال بعد 1952ء میں کراچی میں شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد کی زیر صدارت پاکستان کے تمام جید علماء کا اجلاس ہوا، جس میں 22 نکاتی قرارداد منظور کی گئی۔ فرقہ ورانہ ہم آہنگی کی اس سے بہتر مثال آج تک نہیں ملتی۔ صرف یہ نہیں بلکہ آگے بڑھیے کہ تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے دوران تمام مسالک اور فرقے اپنے عقائد، وجود، نظریات کے تحفظ کے ساتھ ساتھ اس تحریک سے اس طرح وابستہ رہے، جس سے دنیا کو یہ پیغام ملا کہ پاکستان کی عوام اسلام کے نام پر ایک ہے اور ایک رہے گی۔ جیسا کہ شیرانی صاحب نے کہا کہ فرقہ واریت پاکستان کا مسئلہ نہیں ہے، بلکہ فرقہ واریت حکومت کی ضرورت ہے۔ انگریزوں کا Divide and Rule کا فارمولا ہر دور میں اپنایا جاتا رہا ہے اور آج کل پاکستان کی سرزمین اس کے لیے موزوں ترین ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ ہم یہ کام بغیر وردی کے کر رہے ہیں۔ جب ایک وقت میں فرقہ واریت کا ناسور پورے معاشرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہا تھا، اس وقت ملی یکجہتی کونسل کے نام سے ایک ایسے پلیٹ فارم کی تشکیل کی گئی، جس میں فرقہ وارانہ ہم آہنگی دیکھنے کو ملی۔ تمام مسالک کے مذہبی قائدین اور رہنما اختلافات کے باوجود انتہائی ادب و احترام کے ساتھ ملی یکجہتی

کونسل میں شامل رہے۔صرف یہ نہیں بلکہ ایک قدم بڑھ کر متحدہ مجلس عمل کا قیام عمل میں لایا گیا اور جہاں اس کے قیام سے فرقہ واریت میں کمی آئی اور مذہبی ہم آہنگی کو فروغ ملا، وہاں ایک بار پھر مسلمانانِ پاکستان نے اپنا مستقبل اس ادارے سے وابستہ کرلیا۔شاید کسی حد تک ان کی امیدیں بھی پوری ہوئیں،لیکن یہ اور بات تھی کہ ہم اس کو برقرار نہیں رکھ سکے۔شاید حالات ہمیں ایک بار پھر اکٹھا کرسکیں۔جو کام مذہبی طبقات کے کرنے کا تھا، وہ PIPS والے کررہے ہیں۔

یہاں پر تمام وفاق ہائے مدارس کے نمائندگان اور معزز علماء موجود ہیں، چنانچہ یہ فورم اتحاد امت اور فرقہ ورانہ ہم آہنگی کے لیے بہت شاندار ہے، اس لیے اس فورم کا بہترین استعمال ہونا چاہیے۔چونکہ میں گلگت بلتستان حکومت کا حصہ بھی ہوں، اس لیے میں نے وہاں تجویز دی کہ یہاں پر اسلامی نظریاتی کونسل کی طرز پر ادارہ مذہبی مشاورتی ومفاہمتی کونسل قائم کیا جائے۔آخر میں قتیل شفائی کا کلام، جو آج کے حالات کے مطابق ہے، پیش کروں گا۔

فرشتے دیوار و در تیرا بھی ہے میرا بھی ہے
مت جلا اس کو یہ گھر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے
تیرے میرے دم سے ہی قائم ہیں اس کی رونقیں
میرے بھائی یہ نگر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے
کیوں لڑیں آپس میں ہم ایک ایک سنگ میل پر
اس میں نقصان سفر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے
گر کچھ تو کرلے اپنے ضمیروں سے بھی مشورہ
گرچہ راہبر معتبر تیرا بھی ہے میرا بھی ہے

فکری تناظر؛ ڈاکٹر خالد ظہیر

محترم علمائے کرام!

میں آپ کے سامنے امت مسلمہ کی زبوں حالی اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مسئلے کے بارے میں کہ ہم پرامن اور متوازن معاشرے کی تلاش میں ہیں، جس مفروضے پر گفتگو کروں گا وہ مفروضہ ہمارا عقیدہ ہے، یعنی یہ کہ اس دنیا کو نہ امریکہ، نہ اسرائیل اور نہ بھارت چلا رہا ہے بلکہ اس کو اللہ تعالیٰ کی ذات چلا رہی ہے۔اگرچہ کہ یہ بات درست ہے کہ اغیار ہمارے خلاف سازش کرتے رہے ہیں اور کررہے ہیں لیکن اس سے زیادہ درست بات یہ ہے کہ ہم اپنی تباہی و بربادی کے خود ذمہ دار ہیں۔اللہ تعالیٰ ہی اس کائنات کا خالق و مالک ہے۔وہ کسی امریکہ یا کسی اسرائیل کو قطعاً یہ اجازت نہیں دے سکتا کہ وہ اس کائنات کی تباہی و بربادی کی خواہش کریں۔

ایسا کبھی نہیں ہوسکتا کہ ایک جانب اس کے ماننے والے پرخلوص طریقے سے اس کے دین کو اختیار کیے ہوئے ہیں اور دوسری جانب کچھ مخالفین سازشیں کریں اور پھر وہ ان سازشوں میں کامیاب بھی ہوجائیں۔آپ سب جانتے ہیں کہ آپ ﷺ اور قرآن پاک کے نزول سے پہلے امت مسلمہ بنی اسرائیل تھی، اور وہ اللہ کی کتاب اور اس کے پیغام کے حامل تھے۔ان کی اخلاقی و دینی گمراہی کے حوالے سے اللہ تبارک تعالیٰ سورۃ بنی اسرائیل میں فرماتا ہے؛ ''ہم نے تم پر مسلط کیے اپنے بندے، انہوں نے تمہارے گھر تہس نہس کردیے، تمہارے شہروں کو برباد کردیا۔'' اس وجہ سے میں یہ گزارش کروں گا کہ میں سب سے زیادہ فکرمند اس بات پر ہوں کہ ہم میں وہ کیا خرابیاں اور کیا کمزوریاں در آئی ہیں کہ ہمارا رب ہم سے

ناراض ہے اور ہم اس کی تائید اور نصرت سے محروم ہو گئے ہیں اور اغیار کی سازشوں کا مقابلہ نہیں کر پا رہے۔ میں آپ کے سامنے چند باتیں بیان کروں گا اور آپ حضرات کو غور و فکر اور اس پر گفتگو کرنے کی دعوت دوں گا۔

ایک معاشرہ پرامن اسی وقت ہو سکتا ہے جب اس کے افراد متوازن شخصیت اور سوچ کے حامل ہوں۔ اگرچہ سب غیر متوازن اور انتہا پسند لوگ امن شکن نہیں ہوتے لیکن یہ بات طے ہے کہ تمام امن شکن لوگ غیر متوازن اور انتہا پسند ضرور ہوتے ہیں۔ چنانچہ اگر ہمیں اپنے معاشرے سے بدامنی کا خاتمہ کرنا ہے تو لازم ہے کہ ہم غیر متوازن سوچ اور رویوں کو ختم کریں۔ اس غیر متوازن سوچ کے عملی نمونے ہمیں اپنے معاشرے میں ان جملوں کی صورت میں سننے کو ملتے ہیں کہ فلاں شخص یا گروہ واجب القتل ہے یا دائرہ اسلام سے خارج ہے یا پھر یہودیوں کا ایجنٹ ہے اور فلاں لوگ مشرک ہیں، گستاخِ رسول ﷺ ہیں۔ اس لیے ایسے لوگوں کو برداشت کرنا غیرت ایمان کے منافی ہے وغیرہ وغیرہ۔

معاشرے میں متوازن سوچ پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے کہ معاشرے کے افراد میں بالعموم اور علماء میں بالخصوص اپنے نقطۂ نظر سے اختلاف رکھنے والے کے بارے میں حسنِ ظن موجود ہو۔ حسنِ ظن محض اتفاق سے پیدا نہیں ہوتا۔ حسنِ ظن پیدا کرنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ دوسرے کے نقطۂ نظر کو ہمدردی سے سمجھا جائے۔ جب کے مناظرانہ انداز میں دوسرے کے نقطۂ نظر کو رد کرنے کے نتیجے میں نفرت اور حقارت پیدا ہوتی ہے۔ ہمدردانہ علمی فہم کے نتیجے میں اختلاف کے باوجود دوسرے فریق کے نقطۂ نظر کے حوالے سے ہمدردی اور ایک درجہ میں احترام پیدا ہوتا ہے۔ اور اختلاف بھی علمی گفتگو کی حدود میں رہتے ہوئے حق کو جاننے اور پہچاننے کے لیے کیا جاتا ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ کسی کے نقطۂ نظر کے بارے میں انسان کی وابستگی کا اخلاقی و دینی جواز ہی اس وقت پیدا ہوتا ہے جب اس شخص نے مختلف نقطۂ ہائے نظر کا ہمدردانہ جائزہ اس جذبے سے لیا ہو گا کہ اگر اس کو اس میں کوئی حق نظر آئے گا تو وہ اسے قبول کرے گا، دوسری صورت میں اس کا دینی نقطۂ نظر اپنا نہیں بلکہ ماحول کے اثر اور برین واشنگ کا نتیجہ ہے، جو لازماً غیر متوازن رویہ پیدا کرے گا۔ چنانچہ اس مقصد کے حصول کے لیے کہ ہم اپنے معاشرے میں متوازن سوچ اور پرامن رویہ پیدا کریں۔ ضروری ہے کہ علماء کی تعلیم و تربیت کے جو طریقۂ تدریس رائج ہے، ان میں صرف ایک ہی نقطۂ نظر نہ پڑھایا جائے بلکہ مختلف دینی نقطۂ ہائے نظر کو تدریس کا حصہ بنایا جائے اور اساتذہ اور طلباء کے درمیان آزادانہ علمی مکالمے کو فروغ دیا جائے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے علماء کا کردار کلیدی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ پرامن اور متوازن معاشرے کے قیام کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ہم جمعہ کے خطبے، امامت اور مسجد کے بارے میں اس سنت کو زندہ کریں کہ ان کا انتظام مسلمان حکومت کی ذمہ داری ہو۔ جمعہ کا خطبہ حکمران دیں اور وہی امامت کروائیں اور ممکن ہو تو بقیہ نمازوں کی بھی امامت کروائیں۔ حکمران جہاں مناسب چاہیں، اپنی نیابت میں علماء کو اس ذمہ داری کے لیے منتخب کر سکتے ہیں۔ اللہ کے دین کے اس خوبصورت طریقے کے اجراء کے نتیجے میں ایک جانب حکمرانوں کا دین اور مسجد سے تعلق قائم ہو گا اور عوام الناس کے سامنے مستقل جوابدہی کی خوبی پیدا ہو گی تو دوسری جانب جمعہ کے خطبات اور مسجدیں فرقہ وارانہ جھگڑوں کا پلیٹ فارم بننے سے آزاد ہو جائیں گی اور دھیرے دھیرے معاشرے سے غیر متوازن سوچ ختم ہو جائے گی۔ اس تبدیلی کا بڑا فائدہ یہ ہو گا کہ حکومت کے فیصلے کے نتیجے میں علماء کی مسجد میں تعیناتی ان کو مسجد کمیٹی کے اثر و رسوخ سے آزاد کروا کے حکومت کا ملازم بنا دے گی اور وہ حکومت کے ملازمین کی مراعات کے حقدار بھی بن جائیں گے۔ مسجدوں میں علماء کو یہ موقع ملے گا کہ وہ حکومت کی مرضی کے مطابق نماز کے اوقات کا تعین کریں اور عوام الناس کو دین کی تعلیم دیں۔ مساجد کے معاملے میں اس اسلامی طریقے سے متوازن سوچ خود بخود پروان چڑھے گی۔ مسجدیں کبھی فرقہ واریت کے لیے استعمال نہیں ہوں گی اور نہ ہی کوئی گروہ عام آدمی کو دین کے نام پر تشدد اور بدامنی کی طرف ابھار سکے گا۔ علماء کو اس تبدیلی کے برپا کرنے میں بھرپور کردار ادا کرنا چاہیے، کیونکہ ان کی زبان سے دین کا یہ اہم تقاضا مطالبہ کی صورت میں سامنے آئے گا تو اس کے پورے ہونے کے امکانات بھی بڑھ جائیں گے۔

علماء کی جانب سے دینی تعلیم کے انداز اور جمعہ کی نماز اور مساجد کے معاملے میں تبدیلی کے عمل میں بھرپور شرکت کے علاوہ ایک تیسرا اہم

کام جو علماء کر سکتے ہیں اور لازماً کرنا چاہیے کہ وہ اپنے زیر اثر مسلمانوں کو دینی تعلیم دیتے ہوئے اختلافات پر زور نہ دیں بلکہ اخلاقیات پر زور دیں۔ انصاف کرنے، سچ بولنے اور انسانوں کے ساتھ حسنِ سلوک کرنے جیسے اوصاف پیدا کرنے کے لیے لوگوں کو مائل کریں، اور انہیں یہ بتائیں کہ انسانی جان لینا ایک بہت بڑا جرم ہے۔ دوسرے انسانوں کو اذیت دے کر اور ان پر کیچڑ اچھال کر انسان اللہ کی بارگاہ میں کڑی جوابدہی سے نہیں بچ سکے گا۔

علماء جب عوام الناس کو اخلاقیات کا درس دیں گے تو عوام الناس کو یقین ہو جائے گا کہ آخرت میں ان کی کامیابی کا انحصار ان کے کسی مذہبی گروہ کے ساتھ تعلق پر نہیں ہوگا، بلکہ اس بات پر ہوگا کہ وہ اللہ اور اس کے بندوں کے حقوق کس قدر پورا کرتے ہیں، یوں ہمارے معاشرے میں غیر متوازن رویے اپنے آپ ختم ہو جائیں گے۔ اور معاشرہ انشاءاللہ پرامن اور متوازن بن جائے گا۔

صدارتی خطبہ؛ مولانا محمد حنیف جالندھری

اس نشست میں چار فاضل علماء نے خطاب فرمایا ہے۔ ڈاکٹر فرید پراچہ صاحب نے علاقائی، عالمی اور ملکی حالات کے تناظر میں بدامنی اور امن وامان کے قیام اور ایک مثالی معاشرے کے قیام کے لیے قرآن وحدیث اور موجودہ حالات کی روشنی میں گفتگو کی اور ان اسباب کی نشاندہی کی جو بدامنی اور عدم توازن کی وجہ بنتے ہیں۔ ان کی گفتگو کو اگر ایک لفظ میں سمیٹا جائے تو ان کا مرکزی عنوان 'ظلم کا خاتمہ' تھا کہ جب تک ظلم کا خاتمہ نہیں ہوگا، امن قائم نہیں ہوسکتا اور معاشرہ متوازن نہیں ہوگا اور ظلم ایک ایسا لفظ ہے جو بہت وسیع مفہوم رکھتا ہے۔ اس کے بعد ڈاکٹر نجفی نے گفتگو فرمائی، آپ کا موضوع مساوات، عدل وانصاف، آزادی اور تعلیم کو عام کرنے کا تھا۔ ایک مثالی معاشرے کے قیام کے لیے جن چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، آپ نے ان پر گفتگو فرمائی۔ میں نے ان کی گفتگو کا جو خلاصہ نکالا ہے، وہ یہ ہے کہ جب تک حقدار کو اس کا حق نہیں ملے گا، تب تک امن قائم نہیں ہوسکتا اور متوازن معاشرہ تشکیل نہیں پاسکتا، یہ نہیں کہ حق غریبوں کا ہو اور لے امیر جائیں۔ اس کے بعد مولانا عطاءاللہ شہاب صاحب نے فرقہ وارانہ ہم آہنگی کے تناظر میں گفتگو فرمائی۔ ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ بنتا ہے کہ ایک مثالی اسلامی معاشرے کی تشکیل کے لیے مذہبی اور سیاسی وحدت ضروری ہے، تنہا مذہبی وحدت کافی نہیں۔ اور بدامنی کا سبب صرف مذہب کے نام پر چند لوگوں کے پیدا کردہ مسائل ہی نہیں، بلکہ سیاسی مسائل بھی ہمارے معاشرے کو بدامنی اور عدم توازن کا شکار کرتے ہیں۔ اس کے بعد ڈاکٹر خالد ظہیر صاحب نے گفتگو کی۔ اس میں انہوں نے آج کے حالات کا تجزیہ اپنے انداز میں کیا اور حکومت کی بنیادی ذمہ داری کی جانب توجہ مبذول کروائی کہ وہ ایک ریاست کی حیثیت سے مذہبی فرائض کی ادائیگی میں اپنا کردار ادا کرے۔ اگر ان کی گفتگو کا خلاصہ نکالا جائے تو وہ خود احتسابی تھا۔ وہ اپنے احتساب اور محاسبے کی طرف متوجہ کرنا تھا کہ ہم اپنی کوتاہیوں کو صرفِ نظر کرتے ہیں اور دوسروں کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں اور یہ خیال نہیں کرتے کہ ہم خود بھی اس صورت حال کے ذمہ دار ہیں۔ گویا ان کی گفتگو کا خلاصہ یہ تھا کہ ہمیں خود احتسابی کی طرف بھی دھیان دینا چاہیے۔ میں ان چار فاضل علماء کا شکر گزار ہوں کہ انہوں نے مختصر وقت میں موضوع پر گفتگو فرمائی اور اپنے موضوع سے انصاف کیا اور میں نے ان کی گفتگو کا خلاصہ بطور صدر نشست اپنی ذمہ داری سمجھتے ہوئے عرض کیا اور جو نتیجہ اخذ کیا، وہ درست ہوگا۔

اس دوروزہ سیمینار کا عنوان پرامن اور متوازن معاشرے کا قیام اور اس میں علماء کا کردار ہے، لہٰذا میری درخواست ہوگی کہ چونکہ عنوان علماء کا کردار ہے، اس لیے وہ اگلی نشستوں میں گفتگو اپنی ذمہ داریوں اور فرائض کے حوالے سے کریں تو یہ زیادہ مفید ہوگا، یہی اس سیمینار کا مقصد ہے اور تقسیم کار ہے، جس کے لیے اس فکری نشست کا اہتمام کیا گیا ہے کیونکہ جب فکر متحد ہوتی ہے تو اس کا نتیجہ عمل کی صورت میں سامنے آتا ہے۔

کسی بھی معاشرے اور سماج کے لیے امن بنیادی ضرورت ہوتا ہے جیسا کہ انسانی جسم کے لیے ہوا، پانی اور خوراک بنیادی ضرورت ہے۔ اس طرح امن وسلامتی بھی تمام انسانوں کے لیے ضروری ہے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ جب بناء کعبہ ہوئی تو تعمیر کعبہ کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے جو دعائیں کیں، ان میں سے ایک دعا یہ بھی ہے کہ ''رب اجعل ھذا البلدا منا'' (اے اللہ تو اس شہر کو امن والا بنادے)۔ آپؑ کی دعا تمام عالمِ انسانیت کے لیے دعا تھی۔ یہ صرف مکہ شہر کے لیے دعا نہیں تھی بلکہ پوری دنیا کے لیے تھی، کیونکہ بیت اللہ کی حیثیت مرکزِ عالم کی ہے اور جب مرکز میں امن ہو گا تو باقی جگہوں پر بھی امن ہوگا، تو اس لحاظ سے یہ دعائے خلیل تمام انسانوں کے لیے ہے اور تمام ملکوں اور تمام اقوام کے لیے ہے۔ اس دعا نے یہ بتایا کہ بیت اللہ کی آبادی اور اس کی تعمیر کے مقاصد بھی اسی صورت حاصل ہوں گے کہ جب یہاں امن ہوگا اور اگر امن نہیں ہوگا تو نہ یہاں عبادت ہوگی اور نہ حج ہوگا اور دنیا سے بھی لوگ یہاں پر نہیں آسکیں گے۔

بدامنی اور عدم توازن کے جو اسباب ہیں، میرے فاضل رفقاء نے ان پر سیر حاصل گفتگو کی اور آنے والی نشستوں میں بھی اربابِ علم ودانش اس پر اظہارِ خیال فرمائیں گے۔ ہماری نظر میں اس کی بڑی وجہ معاشی محرومی اور معاشی عدمِ توازن ہے۔ جب تک معاشی محرومی کا خاتمہ نہیں ہوگا، اس وقت تک پرامن اور متوازن معاشرہ قائم نہیں ہوسکتا۔ قرآن پاک میں حضرت ابراہیمؑ کی دعا ''رب اجعل ھذا البلدا منا وارزق اھلہ من الثمرات'' کا کئی مرتبہ ذکر آیا ہے، یعنی جہاں وہ امن کی دعا کررہے ہیں، وہاں وہ معاش کی دعا بھی کررہے ہیں۔ سورۃ قریش میں بطور احسان اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''جس نے تمہیں بھوک سے کھلایا اور خوف سے امن عطا کیا''۔ یہاں ترتیب قرآنی میں بھوک کا ذکر، اس کے دور کرنے کا ذکر، معاش کا ذکر اور طعام کا ذکر پہلے ہے اور امن کا ذکر بعد میں ہے۔ اگرچہ 'واؤ' ہمارے ہاں ترتیب کے لیے نہیں، بلکہ مطلق جمع کے لیے استعمال ہوتی ہے، لیکن بعض کے ہاں ترتیب کے لیے بھی ہوتی ہے۔ معلوم ہوا معاشرہ تب متوازن اور پرامن ہوگا، جب معاشی محرومی کو ختم کیا جائے گا۔

دوسری اہم چیز عدل وانصاف کا قیام ہے، ظلم، جبر اور تشدد بھی ہو اور امن بھی ہو تو ایسا ممکن نہیں ہوسکتا۔ جبر وتشدد ہمیشہ بغاوت اور عدل و انصاف ہمیشہ امن پیدا کرتا ہے۔ آج دنیا میں بدامنی خواہ وہ پاکستان میں ہو یا دنیا میں کہیں بھی ہو، اس کی بہت بڑی وجہ یہ ظلم ہے۔ جب تک عدل وانصاف کا قیام نہیں ہوگا، اس وقت تک امن نہیں ہوگا۔ مجھے یاد ہے جب ہم 2004ء میں جنوبی ایشیاء کے وفد کے ہمراہ امریکی سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ کی دعوت پر امریکہ گئے، ہماری آخری نشست اس وقت کے امریکی وزیر خارجہ سے ہوئی تو اس نے کہا کہ میں سب سے ایک ایک سوال پوچھنا چاہتا ہوں، مجھ سے انہوں نے پوچھا کہ مولانا آپ بتائیں کہ مغرب اور مسلم دنیا میں دوری کی وجہ کیا ہے اور ان کو ایک دوسرے کے قریب کیسے لایا جاسکتا ہے؟ میں نے کہا کہ اس کی وجہ بھی آپ ہیں اور اس کا حل بھی آپ کے پاس ہے تو وہ کہنے لگے کیسے اور اس کا حل کیا ہے؟ میں نے جواب دیا کہ آپ کا ظلم اور آپ کی دوغلی پالیسیاں۔ آپ دنیا کو الگ الگ نظر سے دیکھتے ہیں۔ جس دن آپ دنیا کو ایک نظر سے دیکھیں گے تو ہم سمجھیں گے کہ آپ نے منصفانہ پالیسی اختیار کی۔ وہ کہنے لگے کہ میں آپ کی بات سمجھا نہیں۔ میں نے کہا کہ دیکھیں 9/11 کا واقعہ ہوا تو ہم نے اس کی مذمت کی۔ آپ کی قوم اور میڈیا نے اس کو اسلام سے جوڑ دیا۔ میں پوچھتا ہوں کہ ہیروشیما اور ناگاساکی پر جن لوگوں نے بم برسائے، کیا ان کے مذہب کو زیر بحث لایا گیا؟ کیا یہ کہا گیا کہ ان کے مذہب نے ان کو دہشت گردی کی تعلیم دی تھی۔ یوگوسلاویہ کے جس جنرل نے بوسنیا اور ہرزے گوینا میں ساڑھے سات لاکھ بے گناہ مسلمانوں کا قتل عام کیا، کیا اس کے مذہب کو زیر بحث لایا گیا۔ کیا یہ کہا گیا کہ اس کے ذمہ دار عیسائی یا یہودی مذاہب ہیں۔

میں ایک سوچ کی بات کررہا ہوں، فکری بات کررہا ہوں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ کُل ہے اور یہ جزو۔ علاقائی ملکی اور گھر کے معاملات میں جب تک ہماری پالیسیاں دوغلی ہوں گی تو ہم ایک متوازن اور مثالی معاشرہ قائم نہیں کرسکتے۔ اگر میں اپنے مسائل کو اپنے مسلک کی نگاہ سے دیکھوں گا تو میں کبھی اپنے مسائل حل نہیں کرسکوں گا۔ میرے مسلک کا کوئی بندہ خواہ وہ کوئی غلط بات کرے، میں اس کی تاویل کروں اور دوسرے مسلک کا کوئی بندہ

صحیح بات بھی کرے تو میں تردید کردوں۔ جب تک ہمارے تاویل وتردید کے پیمانے حقائق کی بنیاد پر نہیں ہوں گے، اور ہم مسلک کی بنیاد سے بالاتر نہیں ہوں گے تو اس وقت تک ہم اپنی ذمہ داریوں سے انصاف نہیں کر سکتے۔ ہم جب تک اپنے آپ کو فریق کی نظر سے دیکھیں گے تو ہم اپنا کردار ادا نہیں کر سکتے۔ جس دن ہم عملی طور پر ایک دوسرے کے رفیق بننے کا فیصلہ کرلیں گے تو اس وقت ہم پُر امن اور متوازن معاشرہ قائم کرلیں گے۔

اس لیے میں سمجھتا ہوں کہ معاشی محرومی وظلم کا خاتمہ اور عدل وانصاف کا قیام عمل میں آنا چاہیے۔ رنگ ونسل کی بنیاد پر عہدوں کی تقسیم کے بجائے صلاحیت واہلیت کو مدِ نظر رکھنا چاہیے۔ پُر امن اور متوازن معاشرہ اخوت اور بھائی چارے کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ حضور ﷺ نے مکہ مکرمہ میں بھی یہ ہی کیا اور مدینہ منورہ میں ہجرت کے بعد بھی اخوت کی بنیاد پر پُر امن اور متوازن معاشرہ قائم کیا۔ جب تک ہم آپس میں بھائی نہیں بنیں گے، اُس وقت تک معاملات حل نہیں ہوں گے۔ اسی طرح ایثار ہے اور سدِ ذرائع ہے۔

ہم سب علماء بار ہا بیع فاسد پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ خرید وفروخت کے کتنے ہی معاملات ہیں جن کو شریعت ناجائز قرار دیتی ہے۔ اس کی وجہ کیا ہوتی ہے کہ کوئی ایسی شرط لگادی جائے، جس سے کل عاقدین میں جھگڑا ہوسکتا ہے۔ تو اسلام کہتا ہے ایسی خرید وفروخت اور لین دین بھی نہ کرو، جو تمہارے درمیان نزاع کا سبب بن جائے۔ ہر وہ شخص جس سے بائع اور مشتری کے درمیان جھگڑا ہوسکتا ہے، مثال کے طور پر ایک فریق کہتا ہے کہ یہ چیز تم مجھے اب دے دو، میں پیسے تمہیں بعد میں دوں گا اور یہ نہیں بتاتا کہ کس دن دے گا تو یہ جہالت جو ادائیگی ثمن کی ہے، کل کو جھگڑے کا سبب بن سکتی ہے۔ بعد ازاں وہ کہے گا (پھر دے دینا سے میری مراد کل یا پرسوں دے دینا وغیرہ کی تھی)، جبکہ دوسرا فریق کہتا ہے کہ میری مراد تو ایک سال تھی، میں نے تو سوچا تھا کہ جب میری گندم آئے گی، تب دوں گا تو اسلام ایسی شرط جو فریقین کے درمیان جھگڑے کا سبب بنے، اس ذریعے کو بھی بند کردیتا ہے۔ اس طرح اسلام میں حقوق وفرائض کا جو تصور ہے، وہ یہ ہے کہ حقوق دینے کا خیال کرو، حقوق لینے کا خیال نہ کرو۔ جبکہ آج کی دنیا کے فکر اور فلسفے کہتے ہیں کہ دوسروں کے حقوق پورے کرو نہ کرو، اپنے حقوق کے لیے میدان میں آجاؤ۔ علماء کے منبر ومحراب کی ذمہ داری سب سے بڑی ہے۔ اور پھر جب ہم علماء انبیاء کے وارث ہیں تو انبیاء تو انسان کو اللہ سے اور انسان کو انسان سے ملانے کے لیے آتے ہیں اور وہ ایسا انسانی رشتوں کی بنیاد پر کرتے ہیں تو علماء کی ذمہ داری بھی انسان کو اللہ سے اور انسان کو انسان سے ملانے کی ہے، توڑنے کی نہیں بلکہ جوڑنے کی ہے۔

وقفۂ سوالات

سوال: میں بنیادی طور پر سائنس کا طالب علم ہوں اور آپ نے ابھی تک کوئی سائنس کی بات نہیں کی۔ حالانکہ آپ سب علماء سائنسی ایجادات استعمال کر رہے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہوں گا کہ آپ جب مدارس میں درسِ نظامی کی بات کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ سائنسی علوم کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ کم از کم فلکیات کا مضمون نصاب میں شامل کرلیں، جس میں ہم بہت پیچھے ہیں۔ آپ علمائے کرام نے بدامنی کی بہت سی سیاسی وجوہات بیان کی ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کے اس کی وجہ سائنس سے دوری ہے۔ ہمارے اکثر علماء منبر ومحراب سے کہتے ہیں کہ علم کا لفظ جہاں بھی آیا ہے، اس سے مراد دینی علم ہے۔ میں اس بات سے اتفاق نہیں کرتا۔ میں نے جہاں بھی پڑھا ہے، ہر زبان میں علم کا مطلب سائنس ہی ہے۔ اگر یہی صورتحال رہی تو ہم یہ ڈرون حملے ہم کبھی نہیں روک سکیں گے اور بہت پیچھے رہ جائیں گے۔

جواب: (مولانا محمد حنیف جالندھری) میں یہاں یہ وضاحت کردوں کہ یہاں پر اتحاد تنظیمات المدارس کی مرکزی قیادت موجود ہے اور یہ بتاتا چلوں کہ ہمارے وفاقوں میں اور نصاب میں فلکیات کا مضمون اور سائنس کے باقی مضامین بھی شامل ہیں اور باقاعدہ اس کی تعلیم ایک مرحلے تک دی جارہی ہے۔ میں موصوف کو انشاء اللہ وہ تمام کتابیں، سوالیہ پرچے اور وہ تمام تفصیلات جو مدارس کے نصاب میں فلکیات اور سائنس کے حوالے

سے شامل ہیں، پیش کردوں گا۔

سوال: (مولانا عبدالاکبر چترالی) میرا سوال خالد ظہیر صاحب سے ہے، انہوں نے جیسا کہ ارشاد فرمایا کہ مساجد کو حکومت کی تحویل میں دے دیا جائے اور ان میں باقاعدہ مشاورت کے بعد تقاریر ہوں جیسا کہ سعودی عرب اور متحدہ عرب امارات میں ہوتا ہے۔ میرا سوال یہ ہے کہ اگر حکومت اسلامی ہو تو ٹھیک ہے لیکن موجودہ حکومتیں تو فرقہ واریت کو پیدا کرنے کے لیے بنی ہیں اور یہ کبھی نہیں چاہیں گی کہ ملک سے فرقہ واریت ختم ہو اور علماء اسلامی نظام کے لیے اکٹھے ہوں اور وہ متوازن معاشرے، عدل وانصاف اور لوگوں کے حقوق ان تک پہنچانے کے لیے ملکر تحریک چلائیں۔ آپ کسی طرح ہمیں یہ مشورہ دیتے ہیں کہ پہلے ہم اپنی مساجد حکومت کے حوالے کریں، اور پھر ان سے پوچھیں کہ آج کس موضوع پر بات کرنی ہے، کل کس موضوع پر؟

جواب: (ڈاکٹر خالد ظہیر) میں نے جب اپنا یہ نقطہ نظر کسی اور پلیٹ فارم پر پیش کیا تو مجھے ایک صاحب نے ایک سوال کیا کہ جب آپ حکمرانوں کو خطبہ اور امامت کا حق دیتے ہیں اور اگر حکمران کوئی خاتون ہو تو پھر کیا ہوگا؟ میں نے کہا؛ اگر ہمارے ہاں یہ قانون بن جائے اور اس کے بعد مسلمان جانتے بھی ہوں کہ مسلمانوں کا حکمران امامت بھی کرتا ہے اور خطبہ بھی دیتا ہے، تو پھر وہ مسلمان ایک عورت کو حکمران کیونکر بنائیں گے۔ پہلے مسلمانوں کی تربیت کی جائے کہ وہ اپنے دین کو سمجھیں اور اس کی غیرت اپنے اندر پیدا کریں۔ اگر آپ اور میں اصولی طور پر متفق ہوں کہ ایک آئیڈیل اسلامی معاشرے میں ایسا ہی ہونا چاہیے تو ہم اپنی اس دینی فہم کو بغیر کسی رکاوٹ کے بیان کریں۔ ہاں آپ کا اور میرا نفاذ میں اختلاف ہو سکتا ہے۔ میری رائے یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں حکمرانوں میں بھی بہتری پیدا ہو سکتی ہے۔ اگر آپ محسوس کرتے ہیں کہ اس سے بگاڑ پیدا ہو سکتا ہے تو اس پر الگ بحث ہو سکتی ہے، لیکن ہم دین کے اصول کو اصول کے طور پر بیان کریں اور لوگوں کو یہ بتائیں کہ اس طرح ہم آئیڈیل کی طرف جائیں گے تو پھر اس کے نفاذ پر گفتگو ہوگی۔

سوال: (مولانا قاضی محمود الحسن اشرف) اگر ایک طرف صدر پاکستان آصف علی زرداری ہوں اور دوسری طرف ڈاکٹر اسرار صاحب ہوں تو کیا آپ آصف علی زرداری صاحب کے پیچھے نماز عید یا جمعہ پڑھنا پسند فرمائیں گے؟ ہاں یا ناں میں جواب دیں۔

جواب: (ڈاکٹر خالد ظہیر) میں آپ کو حضرت عبداللہ ابن عمرؓ کا واقعہ سناتا ہوں۔ وہ اس بات پر بڑے پریشان رہا کرتے تھے کہ ان کے وقت کے حکمران عصر کی نماز بڑی تاخیر سے پڑھاتے ہیں۔ لیکن انہوں نے کہا کہ میں اپنی عصر کی نماز صحیح وقت پر پڑھ لیتا ہوں لیکن حکمران کے پیچھے پڑھنا میری مجبوری ہے اور ظاہر ہے کہ ہم اگر اصلاح کے لیے آگے بڑھیں گے اور پھر یہ چاہیں کہ زرداری صاحب بھی ڈاکٹر اسرار احمد بن جائیں تو اس کا ایک راستہ ہے اور اس جانب ہمیں پہلا قدم اٹھانا چاہیے۔

سوال: اس طرح کی جب بھی کوئی کانفرنس ہوتی ہے تو ہمارے تمام علماء کرام اتفاق واتحاد کی بات کرتے ہیں۔ پاکستان میں پانچ وفاق المدارس ہیں، لیکن کوئی مشترکہ نصاب ترتیب نہیں دیا گیا۔ معلم الانشاء کے سوا اصول اور فقہ میں کوئی بھی کتاب مشترک نہیں، اس لیے کم از کم اصول اور فقہ کی حد تک کوئی مشترکہ نصاب ترتیب دیا جانا چاہیے، تاکہ اتحاد واتفاق کو ممکن بنایا جا سکے۔

جواب: (مولانا محمد حنیف جالندھری) پاکستان میں پانچ وفاق ہیں جن میں تین کا نام وفاق، ایک کا نام تنظیم المدارس اور ایک کا نام رابطۃ المدارس ہے۔ ان میں سے چار وفاقوں، جن میں تنظیم المدارس اہل سنت، رابطۃ المدارس، وفاق المدارس السلفیہ اور وفاق المدارس العربیہ شامل ہیں، کے نصاب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان میں محض مضامین کی ترتیب کا فرق ہوگا، لیکن کوئی جوہری فرق نہیں۔ مثال کے طور پر ہم اہلسنت، دیوبندی اور بریلوی فقہ حنفی کو مانتے ہیں، اسی طرح وفاق المدارس سلفیہ اور رابطۃ المدارس بھی فقہ کا انکار نہیں کرتے۔ چنانچہ ان کے نصاب میں بھی فقہ کے اسباق شامل ہیں۔ وفاق المدارس شیعہ کے اپنے اصول اور اپنا نصاب ہے، جو کہ شروع سے چلا آ رہا ہے اور دیگر وفاق ہائے مدارس سے

مختلف ہے۔ چنانچہ یہ غلط فہمی ہے کہ ہمارا نصاب ایک نہیں۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہمارے ملک میں جو جدید تعلیم کے ادارے ہیں، ان کے نصاب میں آپ کو زمین و آسمان کا فرق نظر آئے گا۔ مدارس کے نصاب میں بہت معمولی فرق ہے۔ اس لیے آپ اس حقیقت کو مدِ نظر رکھیں اور نصاب کا مطالعہ کریں تو ان میں آپ کے سوال کا تفصیلی جواب موجود ہے۔

سوال: پاکستان کے جتنے بھی کالج اور یونیورسٹیاں ہیں، ان کا نصاب متفرق ہے۔ لیکن ان کا بورڈ ایک ہوتا ہے جبکہ مدارس کے مختلف بورڈز ہیں۔ کیا یہ فرقہ واریت میں اہم کردار ادا نہیں کر رہے؟ کیا یہ مناسب نہیں تھا کہ ایک ہی بورڈ ہو، اور چاروں وفاق کا ایک بورڈ آف گورنرز ہو، جس میں ہر ایک کے دو دو نمائندے شامل ہوں، اور ان کے ذریعے سے ردوبدل کیا جائے۔ کیا اس سے فرقہ واریت کو کم کرنے میں مدد نہیں مل سکتی؟

جواب: (مولانا محمد حنیف جالندھری) پاکستان میں ایک نہیں بلکہ پینتیس، چالیس تعلیمی بورڈز ہیں، جن میں وفاقی بورڈ، راولپنڈی بورڈ، لاہور بورڈ، گوجرانوالہ بورڈ، فیصل آباد بورڈ اور آغا خان بورڈ وغیرہ شامل ہیں۔ ان تمام بورڈز کے نصاب میں بہت زیادہ فرق ہے۔ اس طرح ہمارے مدارس کی جو تنظیمیں ہیں، ان کے پانچ انتظامی بورڈ ہیں اور اپنے اپنے حلقے میں انتظام کی سہولت کے لیے قائم کیے گئے ہیں۔ یہی سوال ہم سے ایک مرتبہ ایک برسر اقتدار اعلیٰ شخصیت نے پوچھا کہ یہاں پر سنی، دیوبندی، شیعہ اور اہلِ حدیث مکاتبِ فکر ہیں اور کہنے لگے کہ اگر ہم آپ کے الگ بورڈ بنائیں گے تو اس سے فرقہ واریت پھیلے گی۔ میں نے کہا کہ آپ بتائیے کہ کیا اسلامی نظریاتی کونسل پاکستان میں آپ تمام فرقوں سے نمائندہ لیتے ہیں یا نہیں؟ اور کیوں لیتے ہیں؟ آپ پورے ملک سے قابل قبول سفارشات لانے کے لیے ہر مکتبۂ فکر کو نمائندگی دیتے ہیں۔ اس طرح سے شرعی عدالت اور امن کمیٹیاں ہیں۔ اگر آپ دنیا میں دیکھیں تو لبنان کے آئین میں ہے کہ ان کا صدر عیسائی، وزیر اعظم سنی اور پارلیمنٹ کا سپیکر شیعہ ہوگا۔ کیوں کہ ان کا وہاں پر ایک وجود موجود ہے۔ یہاں شیعہ، سنی، بریلوی اور اہلحدیث ہیں۔ آپ کسی شیعہ کو کہیں کہ وہ سنی بن جائے اور کسی سنی کو کہیں کہ شیعہ بن جائے اور دیوبندی، بریلوی بن جائے تو ایسا ممکن نہیں ہے۔ جب زمینی حقائق موجود ہیں، تو انتظامی اعتبار سے الگ بھی ہوں تو کوئی فرق نہیں پڑتا۔

آخر میں میں صرف یہ کہوں گا کہ مثالی اور پرامن معاشرے کے لیے ہمیں ایک دوسرے کا احترام کرنا ہوگا، اہانت کے دروازے بند کرنے ہوں گے اور ہم انشاء اللہ اگر حسنِ ظن اور حسنِ نیت سے چلیں گے تو کامیاب ہو جائیں گے۔

سوال: اس قسم کے سیمینارز میں شرکاء مثبت باتیں کرتے ہیں، لیکن کیا وہ انہیں معاشرے میں پھیلانے کی سنجیدہ کوشش کریں گے یا نہیں؟

جواب: (مفتی منیب الرحمان) مجھے یقین ہے کہ سیمینار میں متفقہ طور پر جو سفارشات آئیں گی، سیمینار کے منتظمین ان کو ضرور شائع کریں گے۔ جہاں تک ان کو نافذ کرنے کی بات ہے تو یہ ان کا کام نہیں۔ جو طبقہ یہاں پر موجود ہے، وہ رضا کارانہ طور پر کسی حد تک ایک قدم آگے بڑھا سکتا ہے، مگر ہمیں کوئی بلند و بالا خواہشات قائم نہیں کرنی چاہئیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ قدم اولین کے طور پر اگر ذہن سازی کا عمل شروع ہو جائے تو یہ بھی بہت بڑی کامیابی ہے۔

جواب: (محمد عامر رانا) یہاں پر سیمینار کے نتائج کے حوالے سے سوال کیا گیا اور مفتی صاحب نے اس کا بڑا اچھا جواب دیا۔ اس کا طریقۂ کار یہ ہوگا کہ سیمینار کی رپورٹ دو زبانوں انگریزی اور اُردو میں شائع ہوگی اور میڈیا کو بھی جاری کی جائے گی۔ جہاں تک اس نشست کا بنیادی مقصد ہے، وہ معزز علماء کے کردار کے حوالے سے ہے۔ یہ اس سلسلے کی پہلی نشست ہے اور ہماری کوشش ہے کہ اس سال کے دوران اس طرح کی کئی اور نشستوں کا اہتمام کیا جائے، تاکہ کچھ جامع اور باقاعدہ تجاویز سامنے آئیں۔ پھر ان کو ہم مزید علماء کے پاس لے کر جائیں اور اگر کہیں ریاست یا حکومت کے تعاون کی ضرورت پڑے تو اس کے لیے بھی کوشش کر کے دیکھی جائے کہ وہاں سے تعاون ملتا ہے یا نہیں یا معاشرے کے جو دیگر طبقات ہیں، کیا وہاں سے کوئی معاونت حاصل ہو سکتی ہے یا نہیں۔

پاکستان میں پُرامن معاشرے کے قیام میں درپیش چیلنجز

(دوسری نشست)

صدارت: علامہ سید فرحت حسین شاہ
مرکزی ناظم اعلیٰ، منہاج القرآن علماء کونسل

مقررین

مولانا ڈاکٹر راغب نعیمی، پرنسپل جامعہ نعیمیہ گڑھی شاہو، لاہور
ڈاکٹر قبلہ ایاز، ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ آف اسلامک سٹڈیز، پشاور
قاری ضمیر اختر منصوری، مہتمم جامعہ الفلاح، ناظم آباد کراچی
علامہ اکبر حسین زاہدی، وائس پرنسپل جامعۃ الصادق، کوئٹہ
مولانا قاضی محمود الحسن اشرف، پرنسپل دارالعلوم اسلامیہ، مظفر آباد

پنجاب کا تناظر؛ مولانا ڈاکٹر راغب نعیمی

PIPS کے زیر اہتمام کانفرنس کے دوسرے سیشن جس کا عنوان 'پاکستان میں پرامن اور متوازن معاشرے کے قیام میں درپیش چیلنجز' ہے، اس میں مَیں پنجاب کے تناظر میں گفتگو کروں گا۔ جب ہم پنجاب کے حالات کا ملک کے دیگر صوبوں کے ساتھ موازنہ کرتے ہیں تو پنجاب کی صورتِ حال باقی صوبوں کی نسبت کئی اعتبار سے ممتاز نظر آتی ہے۔ سب سے پہلے یہ کہ پنجاب پاکستان کا آبادی کے لحاظ سے سب سے بڑا صوبہ ہے۔ پاکستان میں کراچی کے بعد آبادی کے اعتبار سے بڑے گنجان آباد شہر پنجاب میں ہی نظر آتے ہیں جن میں لاہور، فیصل آباد، ساہیوال، راولپنڈی وغیرہ شامل ہیں۔ چونکہ امن وامان کا انحصار خاصی حد تک آبادی کے معاملات اور ان کے مسائل سے متعلق ہوتا ہے، اس لیے کسی بھی شہر کی آبادی جتنی زیادہ ہوگی، وہاں امن وامان کی صورت حال بھی اتنی ہی خراب ہوگی یا وہاں امن وامان کے مسائل بھی زیادہ ہوں گے۔ بنیادی وجہ یہ ہے کہ امن وامان قائم کرنے والے ادارے، خاص طور پر جب ہم پولیس کی بات کرتے ہیں تو آبادی کے تناسب سے پولیس کی کارکردگی اور امن و امان کے حوالے سے اس کے اقدامات ناگفتہ اور ناکافی ہیں۔ وہ تھانے جو کہ آج سے سو سال پہلے بنے تھے، آج بھی وہی کام کر رہے ہیں۔ نئے تھانوں کا قیام آبادی کی شرح کے ساتھ بڑھتا ہوا نظر نہیں آ رہا۔

گنجان آباد ہونے کے باعث شہر مختلف قسم کے سماجی مسائل کا شکار ہوتے ہیں، ان مسائل میں تعلیم کی ہر طبقے تک رسائی نہ ہونا اور طبقاتی تفریق شامل ہے۔ ایک ہی شہر میں رہتے ہوئے افراد کا اس انداز سے تقسیم ہو جانا کہ ایک طرف بحریہ ٹاؤن، گلبرگ اور ڈیفنس جیسی متمول آبادیاں موجود ہیں جہاں پر کوئی بھی گھر کروڑوں سے کم نظر نہیں آتا، تو وہاں ان آبادیوں کے قرب میں ہی کچی آبادیاں بھی ہیں، جہاں کے گھر صرف ایک کمرے پر مشتمل ہیں اور جب برسات کا موسم آتا ہے تو سب سے زیادہ نقصان ان کچی آبادیوں کا ہی ہوتا ہے۔ جب کسی بھی شہر کی آبادی ایک

خاص حد سے تجاوز کر جاتی ہے، تو اس کی وجہ سے وہاں پر غیر متوازن رویوں کے حامل افراد کی کثرت نظر آتی ہے۔ چھوٹے شہروں میں لوگ ایک دوسرے کو جانتے ہیں اور لوگ قرب وجوار میں ہونے والی مشکوک سرگرمیوں سے آگاہ ہوتے ہیں، اور جب کبھی امن وامان کا مسئلہ ہوتا ہے تو وہ ان افراد کے حوالے سے خبردار ہوتے ہیں۔ لیکن گنجان آباد شہروں میں کسی بھی شخص کی پہچان آسانی سے نہیں ہو پاتی۔ لوگ دیگر شہروں سے آکر قیام کرتے ہیں اور انہیں آسانی سے کرائے پر گھر مل جاتے ہیں جس کی وجہ سے جرائم پیشہ افراد ان بڑے شہروں میں قانون نافذ کرنے والے ادارے کی نظروں سے پوشیدہ رہتے ہوئے امن وامان کے مسائل پیدا کرتے ہیں، یوں چوریاں اور ڈکیتیاں عام ہو جاتی ہیں۔

پھر جب ہم کسی بھی کثیر آبادی والے شہر کی بات کرتے ہیں تو ہمیں وہاں دیگر بنیادی سہولیات کا فقدان بھی نظر آتا ہے۔ آپ اسلام آباد کو ہی دیکھ لیں کہ جہاں پر پانی بعض علاقوں میں ٹینکرز کی شکل میں پہنچتا ہے۔ اسی طرح سماجی طور پر لوگوں کو زندگی گزارنے کے لیے بہت سی مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ان حالات میں وہ افراد جن کی تربیت صحیح نہیں ہوئی ہوتی تو وہ آسانی کے ساتھ غیر متوازن رویوں کے زیرِ اثر آجاتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں امن وامان کا مسئلہ پیدا ہوتا ہے، اور پنجاب کو خصوصیت کے ساتھ اس مسئلے کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے۔

صوبے میں تعلیمی سہولیات کا فقدان بھی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی لاہور میں Lums، گورنمنٹ کالج یونیورسٹی جیسے بڑے اور مہنگے تعلیمی ادارے قائم ہیں۔ اب ایک ٹاٹ سکول میں پڑھنے والا بچہ جب اپنے سکول سے چند فرلانگ دور تعلیمی ادارے میں بچوں کو لگژری کاروں میں آتے دیکھتا ہے تو اس میں احساسِ محرومی پیدا ہوتا ہے۔ یہ احساس آگے جا کر اسے ایسے کام کرنے پر مجبور کر دیتا ہے، جو معاشرے میں امن وامان کے مسائل پیدا کرنے کا سبب بنتے ہیں۔ اس کے بعد جب ہم پنجاب کے دیہی علاقوں میں دیکھتے ہیں تو وہاں پر ہمیں دوسری طرح کے مسائل ملتے ہیں۔ دیہی علاقوں میں تعلیمی سہولیات کا فقدان اور سماجی ڈھانچہ شکستہ ہے، یعنی ایک شہری کو جو سہولیات ملنی چاہیں، وہ ان پسماندہ علاقوں کے باسیوں کو نہیں مل پاتیں، جس کی وجہ سے ان علاقوں کے باسی اپنے مسائل کے حل کے لیے منفی طریقے اختیار کرتے ہیں۔ اس وقت معاشرے میں جو سماجی ومعاشی عدم توازن ہے، وہ ایک عفریت کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ وسطی پنجاب کے شہر لاہور، اکاڑہ، ساہیوال، گوجرانوالہ اور سیالکوٹ وغیرہ معاشی اعتبار سے مستحکم نظر آتے ہیں، جب کہ اس کے مقابلہ میں پوٹھوہار اور جنوبی پنجاب میں غربت اور پسماندگی اپنے عروج پر پہنچ چکی ہے، جہاں دہشت گردی اور انتہا پسندی کی جڑیں مضبوط ہوتی جا رہی ہیں، جو آگے چل کر نہ صرف پنجاب، بلکہ پاکستان میں امن وامان کے قیام میں مسئلہ بن سکتی ہیں جس کا تدارک کیا جانا چاہیے۔

پھر مذہبی منافرت ہمارے سامنے ہے جو بین المسالک فرقہ واریت کی صورت میں یا پھر ایک ہی مسلک میں مختلف نظریات کے حامل افراد کے آپس میں تصادم کی صورت میں موجود ہے، جن کے سبب علماء کرام پر پابندیاں لگ جاتی ہیں، مثال کے طور پر محرم یا ربیع الاول کے ایام میں مختلف علمائے کرام پر مختلف علاقوں اور اضلاع میں داخلے پر پابندی ہوتی ہے۔ یہ پابندیاں اسی فرقہ واریت کا نتیجہ ہیں جو اس وقت ہمارے معاشرے کی بنیاد کو کھوکھلا کرتی ہوئی نظر آ رہی ہیں۔ اسی حوالے سے ایک اہم مسئلہ یہ بھی ہے کہ شہروں میں جو مساجد اور مدارس ہیں، ان سے منسلک دینی رہنمائی کرنے والے اماموں اور خطباء میں سے تقریباً 95 فیصد کا تعلق ان پسماندہ علاقوں سے ہی ہے۔ خاص طور جنوبی پنجاب کے شہروں مظفر گڑھ، راجن پور، ڈیرہ اسماعیل خان اور ملتان اور سرائیکی بیلٹ کے علماء کرام جب مدارس میں آتے ہیں اور اپنی تعلیم مکمل کرتے ہیں تو پھر وہ اسی شہر میں سکونت پذیر ہو جاتے ہیں جہاں سے انہوں نے تعلیم حاصل کی ہوتی ہے اور وہ واپس اپنے علاقوں میں نہیں جاتے۔ جس طرح سے ان کی تربیت اور ذہن سازی پروان چڑھتی ہے، اسی کے مطابق وہ شہروں میں کام کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ شہروں میں انصاف کی فراہمی کا طریقۂ کار اور طرح کا ہوتا ہے اور دیہات میں اس سے یکسر مختلف ہوتا ہے۔ جاگیردار اور وڈیرے اپنے مزارعوں کو اپنی مرضی کا انصاف دیتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اگر کوئی فرد متوسط طبقے سے تعلق رکھتا ہو تو اس کو مقدمات میں اُلجھا دیا جاتا ہے۔

عدم مساوات خصوصیت کے ساتھ جنوبی پنجاب میں موجود ہے۔ جاگیردار طبقہ جن میں ٹوانے، مزاری، لغاری، گیلانی، جیلانی اور انصاری وغیرہ شامل ہیں، انہوں نے لوگوں کو 'آکٹوپس' کی طرح دبوچا ہوا ہے اور نہ ان کی تعلیم کی طرف توجہ دی جاتی ہے اور نہ ہی ان کی رہنمائی کی جاتی ہے۔ ان میں یہ جرأت بھی پیدا نہیں کی جاتی کہ وہ شہروں کی طرف نکل کر اپنی زندگی کے لیے تگ ودو کر سکیں۔ ان حالات کے باعث ضرورت اس اَمر کی ہے کہ سماجی شعبے میں ترقی کی جائے۔ اگر ہم نے اس موقع کو غنیمت نہ جانا اور سماجی اعتبار سے ترقی نہ کی تو وہ نوجوان جو اس وقت اپنے مستقبل کے بارے میں بڑی غیر یقینی کی صورتحال کا شکار ہیں، اُنہیں انتہا پسندی اور دہشت گردی کا پیغام بڑا پرکشش محسوس ہوگا۔ اور اسی غیر یقینی صورت حال کے باعث وہ انتہا پسندوں کے ہتھے چڑھ جائیں گے۔ پھر وہ انتہا پسند انہیں جس مقصد کے لیے استعمال کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ ماضی میں ہمارے سامنے پنجاب سے تعلق رکھنے والی تین چار کالعدم تنظیموں کے نام موجود ہیں جن سے ہزاروں کی تعداد میں نوجوان منسلک ہیں۔ ایک تو کالعدم تنظیم ایسی بھی ہے جس کے کارکنوں کی تعداد ایک لاکھ سے بھی زیادہ ہے۔ انتہا پسند عناصر اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے نوجوانوں کو اپنی طرف مائل کر لیتے ہیں۔ اور وہ ایک ایسا تصوراتی امتیاز قائم کر دیتے ہیں کہ وہ امتیاز اس نوجوان کو یہ سمجھنے پر مجبور کر دیتا ہے کہ میں بھی خالد بن ولید یا یوسف بن تاشفین جیسا ایک مافوق الفطرت انسان بن چکا ہوں جس نے اس معاشرے کو ٹھیک کرنا ہے اور وہ بھی جہاد کے نام پر۔ اس تمام صورت حال کو دیکھتے ہوئے میں آخر میں یہ کہوں گا کہ بلند اخلاقی اقدار، قانون وانصاف اور مساوات پر مبنی معاشرے کے قیام سے ہی ہم پنجاب میں امن وامان قائم کر سکتے ہیں اور اگر یہ چیزیں ہم نے اپنے معاشرے میں پنپنے نہ دیں تو پھر امن وامان قائم کرنا مشکل ہو جائے گا۔

خیبر پختونخوا کا تناظر؛ ڈاکٹر قبلہ ایاز

معزز علمائے کرام!

یہ انتہائی خوش بختی کا موقع ہے کہ اسلام آباد میں ادارہ برائے مطالعہ امن نے اس طرح کے پروگرام کا اہتمام کیا ہے، جس میں ملک بھر سے مختلف نقطۂ نظر کے جید علمائے کرام جمع ہوئے ہیں اور وہ آج کے دور کے بہت ہی اہم موضوع پر تبادلہ خیال کر رہے ہیں۔ میں خود ایک عالم نہیں ہوں لیکن علماء کی محفل کا ایک فرد ہوں اور ان کا شکر گزار ہوں۔ بہر حال جو کچھ علماء سے سیکھا ہے، اس کے تناظر میں خیبر پختونخوا میں امن کے حوالے سے درپیش چیلنجز پر آپ سے گفتگو کروں گا۔

قبائلی علاقے انتظامی طور پر خیبر پختونخوا کا حصہ نہیں ہیں لیکن جغرافیائی حوالے سے جب ہم خیبر پختونخوا کا ذکر کرتے ہیں تو لازماً قبائلی علاقوں کا ذکر بھی کرنا پڑے گا، کیونکہ ہم ان موضوعات میں قبائلی علاقوں کو خیبر پختونخوا سے الگ نہیں کر سکتے۔ چنانچہ جب میں اپنی گفتگو میں خیبر پختونخوا کا ذکر کروں گا تو قبائلی علاقے بھی اس میں شامل ہوں گے۔ اس وقت خیبر پختونخوا امن وامان کے حوالے سے نہ صرف پاکستان بلکہ پوری دنیا کا مشکل ترین علاقہ بن چکا ہے اور پوری دنیا کی سیاست کا محور خیبر پختونخوا بشمول قبائلی علاقہ جات ہیں۔ اگر ہم ان کی تاریخ دیکھیں تو یہ علاقے دنیا کے وہ علاقے تھے جہاں مذہبی اور فرقہ وارانہ ہم آہنگی مثالی تھی۔ بہت کم لوگوں کو یہ علم ہوگا کہ خیبر پختونخوا میں شیعہ، سنی کے علاوہ دوسرے مسالک کے لوگ بھی موجود ہیں اور وہ بہت طاقتور ہیں۔ مثال کے طور پر پشاور کے بازاروں میں آپ کو سکھوں اور ہندوؤں کی بہت بڑی تعداد ملے گی۔ پشاور میں مسیحی ادارے بھی قائم ہیں۔ ایڈورڈز کالج کے علاوہ بھی بہت سے معروف ادارے ہیں۔ سکھ کمیونٹی نہ صرف بونیر بلکہ قبائلی علاقے تیراہ میں بھی ان کی بہت بڑی تعداد آباد ہے اور بنوں کے دیہاتوں میں شیعہ بستے ہیں۔ اگرچہ یہ ایک مذہبی علاقہ ہے، لیکن وہاں ہندو اب تک مختلف دیہاتوں میں آباد ہیں جو وہاں کے مَلک یعنی خان تھے، اور جرگوں کا حصہ ہوتے تھے اور ان کو بڑے عزت اور احترام سے دیکھا جاتا تھا۔ نہ صرف یہ کہ قادیانی بھی اس خطے میں آباد ہیں بلکہ وہ معتبر خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی طرح بنوں کا ایک پورا گاؤں قادیانی ہے، جس کو عظیم

قلعہ کہتے ہیں، وہ معتبر خاندانی لوگ ہیں۔

خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقوں میں مختلف مسالک اور مذاہب کے لوگوں کے درمیان قبل ازیں کوئی تصادم نہیں ہوا۔ یہ سلسلہ افغان مزاحمت کے بعد شروع ہوا اور ہم اس سارے مسئلے کو محض علماء کے حوالے سے نہیں دیکھ سکتے، بلکہ اس حوالے سے بہت سے نادیدہ ہاتھ کام کر رہے تھے، جن کو صرفِ نظر کرنا ناممکن ہے۔ افغان جہاد کے بعد خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقوں کی معاشرتی تنظیم شکست وریخت کا شکار ہوگئی اور نیا معاشرتی ڈھانچہ وجود میں آ گیا۔ پہلا معاشرتی ڈھانچہ جرگہ کے اصول پر قائم تھا، یعنی سفید پگڑی اور سفید داڑھی والے لوگوں کا احترام اور ان کے اصولوں پر عمل کیا جاتا تھا۔ افغان جہاد کے بعد یہ تمام سماجی ادارے کمزور ہو گئے اور نئے ادارے تشکیل پا گئے۔ چنانچہ حالات ایسے بن گئے جو کہ بہت پریشان کن ہیں۔ فرقہ ورانہ حوالے سے خیبر پختونخوا میں ہنگو اور پاراچنار کے علاقے کشیدگی کا شکار ہیں اور لوگ پشاور سے پاراچنار تک کا سفر نہیں کر سکتے۔ مجبوراً ان کے لیے ہیلی کاپٹر کا اہتمام کیا جاتا ہے یا وہ براستہ افغانستان سفر کرتے ہیں جو خاصا مہنگا پڑتا ہے۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں جہاں شیعہ بھی ہیں اور سنی بھی۔ وہاں پر قائم یونیورسٹی کے بڑے بڑے جید اساتذہ فرقہ واریت کا شکار ہوئے محض اس بنا پر کہ ان کا ایک خاص فرقے سے تعلق تھا۔ اسی طرح ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک نیا گروپ تشکیل پایا ہے جس کو پتھری گروپ کہتے ہیں۔ پتھری گروپ سے مراد یہ ہے کہ وہ اپنے مؤقف پر پتھر کی طرح سخت ہیں اور اس سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ خیبر پختونخوا سے متصل قبائلی علاقوں، خاص طور پر اگر آپ وزیرستان جائیں تو آپ کو یہ محسوس نہیں ہوگا کہ یہ پختونوں کا علاقہ ہے۔ وہاں پر آپ کو دنیا بھر کے لوگ ملیں گے، جن کا تعلق خیبر پختونخوا اور فاٹا سے نہیں ہے۔ خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقوں میں جو مسئلہ درپیش ہے، پوری دنیا کی سیاست اس صورت حال کے اردگرد گھوم رہی ہے اور اب ظاہر ہے کہ اس میں علماء کا ایک کردار بھی ہے۔ اس حوالے سے میں ایک چھوٹی سی مثال دیتا ہوں۔ ذوالفقار علی بھٹو نے بلوچستان کی حکومت ختم کی، جس کے نتیجے میں خیبر پختونخوا کے اس وقت کے وزیرِ اعلیٰ مفتی محمود نے استعفٰی دے دیا۔ لیکن بلوچ پہاڑوں پر چلے گئے۔ جب مفتی محمود سے کہا گیا کہ لاکھوں قبائلی بندوق اٹھائے آپ کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں تو آپ نے ان کو بڑی سختی کے ساتھ منع کیا، اور کہا کہ ہم آئینی اور پرامن جدوجہد کریں گے۔

انہوں نے کہا کہ بھٹو صاحب! آپ نے مجیب کو بھگا دیا، ہم لوگ آپ کو بھگا دیں گے۔ انہوں نے پُرامن طریقے سے بھٹو کے خلاف جدوجہد جاری رکھی اور اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت علماء پُرامن جدوجہد کے قائل اور مسائل کو آئینی اور جمہوری طریقے سے حل کرنے کے خواہاں تھا۔ بلوچوں نے پہاڑوں پر جا کر نقصان کیا، حالانکہ پشتون بھی پہاڑوں پر جا سکتے تھے، لیکن وہ نہیں گئے۔ اسی کے بعد ہم اس خطے میں ملی یکجہتی کونسل دیکھتے ہیں، جو کہ بہت فعال تھی، جس کے بعد متحدہ مجلس عمل کی حکومت برسرِ اقتدار آئی۔ سوائے ایک واقعہ کے ایم ایم اے کا پورا پانچ سال کا دور مذہبی ہم آہنگی کا دور تھا، اور انہوں نے تمام مسائل مل بیٹھ کر حل کئے۔ اب ایسے حالات دوبارہ بننا شروع ہو گئے ہے۔ امن وامان کی اس تشویش ناک صورتحال کا تعلق چونکہ افغانستان سے ہے، لہٰذا آپ خیبر پختونخوا، فاٹا اور قبائلی علاقہ جات میں امن وامان کے مسائل کو افغانستان سے الگ کر کے نہیں دیکھ سکتے۔ ان چیلنجز میں علماء کے لیے ایک بہت بڑا کردار ہے اور وہ یہ ہے کہ علمائے کرام ہی اس مسئلے کو حل کر سکتے ہیں۔ علمائے کرام ہی طالبان اور امریکہ کے درمیان پل کا کردار ادا کر سکتے ہیں۔

اس وقت دنیا میں دو لابیاں فعال ہیں، ایک پیس لابی اور دوسری وار لابی۔ وار لابی افغانستان میں بھی ہے اور خیبر پختونخوا و قبائلی علاقوں میں بھی ہے، پاکستان میں بھی ہے اور امریکہ اور یورپ میں بھی۔ جبکہ اسی طرح پیس لابی بھی دنیا کے تمام خطوں میں موجود ہے۔ اب ہم نے یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں وار لابی کا حصہ بننا ہے یا پیس لابی کا۔ وار لابی وہ ہے جو اس خطے میں جنگ جاری رکھنا چاہتی ہے اور پیس لابی وہ ہے جو اس مسئلے کا حل چاہتی ہے۔ کوئی مانے یا نہ مانے اوباما پیس جبکہ امریکی فوج وار لابی کا حصہ ہے۔ وہ چاہتی ہے کہ اس جنگ کو جاری رکھا جائے۔ اوباما کی یہ خواہش ہے کہ کسی نہ کسی طرح افغانستان سے نکلا جائے، چنانچہ پیس لابی وہاں بھی موجود ہے۔ ہمارے یہاں بھی وار لابی اور پیس لابی فعال ہے۔

لیکن جنگ کی بہت بڑی معیشت ہے، جس کا حجم اربوں کھربوں روپے ہے جس سے امریکہ میں بھی لوگ کمارہے ہیں، جبکہ پاکستان اور افغانستان میں بھی معاشی فوائد حاصل کررہے ہیں۔ جب تک وارلابی معاشی ثمرات حاصل کرتی رہے گی، وہ کبھی یہ نہیں چاہے گی کہ اس جنگ کا خاتمہ ہو۔ علمائے کرام اور ہمارا دینی طبقہ لاشعوری طور پر وارلابی کے اہداف کا شکار بن جاتے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ہم پیس لابی کا حصہ بن جائیں، اور علمائے کرام کے اندر اس قدر استطاعت ہے کہ اگر وہ پیس لابی کا حصہ بن جائیں تو افغانستان کی جنگ ختم ہوسکتی ہے۔

خطے کی موجودہ صورت حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے علمائے کرام کو اپنا کردار ادا کرنے کے لیے میدان میں آنا چاہیے۔ انہیں چاہیے کہ وہ طالبان کو سمجھائیں۔ خیبر پختونخوا میں کچھ ایسے علماء ہیں جو طالبان کو سمجھا سکتے ہیں کہ موجودہ بین الاقوامی حالات کے تناظر میں افغانستان میں آپ نے قومی مفاہمت کی حکومت بنانی ہے اور اس میں وہ تمام لوگ شامل ہوں جن کا افغانستان کی سرزمین سے تعلق ہو۔ یہ چیز اسلام کے آئین کے تقاضے کے عین مطابق ہے۔ یہ حقائق کی دنیا ہے، خواہشات کی دنیا نہیں کہ اب ایسا ممکن نہیں کہ افغانستان میں جو دیگر فریق ہیں، آپ انہیں افغانستان کی سیاست سے بے دخل کر کے حکومت بنائیں۔ کہ کچھ لوگ یہ چاہتے ہیں کہ اس کا حل مذاکرات کے ذریعے نہ ہو اور اگر مذاکرات کے ذریعے حل نہ ہوا تو میں کہہ سکتا ہوں کہ یہ پورا خطہ امریکہ کے نکلنے کے بعد خانہ جنگی کی صورت اختیار کر جائے گا اور خون کا ایک بہت بڑا دریا اس خطے میں بہے گا۔ لیکن اگر مذاکراتی عمل کے نتیجے میں اس کا حل نکل آئے جس کی ایک صورت موجود ہے اور علمائے کرام کو اللہ تعالیٰ نے موقع دیا ہے کہ وہ آگے آئیں اور اپنا کردار ادا کریں۔ اس وقت علماء کرام کی ذمہ داری ہے کہ وہ مل کر بیٹھیں اور سوچیں کہ افغانستان کا بعد از امریکہ کیا حل ممکن ہوسکتا ہے۔

ہماری یہ ذمہ داری نہیں کہ ہم یہ سوچیں کہ 2 مئی (امریکی آپریشن میں اسامہ بن لادن کی ہلاکت) کا واقعہ جھوٹا ہے یا سچا۔ ہمیں اب دیکھنا ہوگا کہ ہمیں 2 مئی کے واقعہ کے بعد کیا کرنا چاہیے اور ہم کس نقطے پر اتفاق کر سکتے ہیں اور ہم امریکہ سے کہیں کہ ہمیں اب آپ کی یہاں ضرورت نہیں۔ امریکہ کے اندر جو پیس لابی کام کر رہی ہے، وہ بھی حکومت اور فوج سے یہ مطالبہ کرتی ہے کہ افغانستان سے امریکی فوجوں کا فوری انخلا عمل میں لایا جائے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ اس لابی کو مضبوط کیا جائے اور یہ کام ہمارے علماء کر سکتے ہیں۔ امریکہ شاید یہ بات براہِ راست نہ کرے اور اس کے لیے اقوام متحدہ سے خدمات حاصل کی جاسکتی ہیں، جیسا کہ ماضی میں کیا چکا ہے۔

اس خطے کے علماء متفق ہوکر اقوامِ متحدہ سے مطالبہ کریں کہ وہ افغانستان کے لیے اپنا نمائندہ مقرر کرے۔ وہ نمائندہ ترکی کا بھی ہوسکتا ہے اور ملائیشیا کا بھی، کیونکہ طالبان ان ممالک کا بہت احترام کرتے ہیں۔ ترکی میں طالبان کا دفتر قائم ہو چکا ہے، جبکہ امریکہ کے ساتھ بھی اس کے روابط بہت مثبت ہیں کیونکہ ترکی نیٹو کا حصہ بھی ہے۔ ہم نے ماضی سے ہٹ کر مستقبل کے چیلنجوں کی طرف دیکھنا ہے۔ علمائے کرام اپنے اثر ورسوخ سے فائدے اٹھاتے ہوئے دنیا میں اور اس علاقے میں امن قائم کرنے میں اپنا کردار ادا کریں۔ عالمی سیاست مفادات کے اردگرد گھومتی ہے، تو ہمیں یہ دیکھنا ہوگا کہ آج کے ان حالات میں ہمارے مفادات کیا ہیں۔ مسلمانوں کے مفادات کیا ہیں اور اس خطے کے مفادات کیا ہیں؟ میں PIPS کو مشورہ دوں گا کہ وہ آئندہ اس موضوع پر سیمینار منعقد کروائے اور ایسے علمائے کرام کو مدعو کرے جو اس خطے میں اثر ورسوخ رکھتے ہوں اور امن کے لیے طالبان اور اس طرح کے دیگر گروپس کے ساتھ مذاکرات کر سکتے ہوں۔ اس طرح ہم گفت وشنید کے ساتھ عمل کی جانب بڑھ سکیں گے۔

سندھ کا تناظر؛ قاری ضمیر اختر منصوری

معزز علمائے کرام!

جس طرح آپ لوگ اپنے علاقوں کے دُکھ درد لے کر یہاں اکٹھے ہوئے ہیں، میں صوبہ سندھ میں امن وامان کو درپیش چیلنجز آپ کے

سامنے پیش کروں گا۔ اس لیے کہ میرا تعلق سانگھڑ سے ہے اور میں کراچی میں رہائش پذیر ہوں۔ صوبہ سندھ جو صدیوں سے باب الاسلام کے نام سے معروف ہے، علمائے کرام جانتے ہیں کہ ہزاروں مدارس اور اولیاء کرام کی خدمات اس خطے سے وابستہ ہیں، گویا کہ قیام پاکستان سے پہلے اسلام کا ایک قلعہ موجود تھا اور آج وہ امن کو ترس رہا ہے۔ امن کے حوالے سے درپیش چیلنجز کا سدباب نہ کیا گیا تو میرے دوستو اللہ نہ کرے کہ ایک بار پھر اس طرح کے دن دیکھنا پڑیں کہ پاکستان جتنا ہے، اتنا بھی نہ رہے۔

سندھ شہری اور دیہاتی آبادی میں منقسم ہے، جہاں مختلف چیلنجز درپیش ہیں۔ جتنا جلدی ممکن ہو سکے ان پر قابو پانے کی ضرورت ہے۔ کوئی دن ایسا نہیں کہ لاشوں کا انبار نہ لگے۔ ایک جنگ جاری ہے۔ انسان کی قدر و قیمت بالکل ختم ہو چکی ہے۔ سب سے بڑا چیلنج سندھ اور پاکستان کے لیے یہ ہے کہ ہم نہ تو اپنے دشمن کا تعین کر سکے اور نہ ہی اپنی منزل کا۔ ہم سب علماء کرام آج یہ فیصلہ کر لیں کہ ہم سب کا مشترکہ دشمن کون ہے اور یہ ہم سب جانتے ہیں کہ وہ کون ہے، امریکہ ہمارا اور امتِ مسلمہ کا مشترکہ دشمن ہے اور ہماری مشترکہ منزل پاکستان میں اسلامی نظام کا قیام ہے، کیونکہ پاکستان کا مطلب کیا، لا الہ اللہ۔ پاک کا مطلب پاک سرزمین اور پاک سرزمین کو امن کا گہوارہ بنانے کے لیے قرآن وسنت کے پاکیزہ نظام کو پاکیزہ قیادت کے ذریعے نافذ کیا جائے۔ اگر ہم یہ وعدہ پورا نہیں کریں گے تو اسی طرح لٹتے رہے گے، مٹتے رہے گے اور امن کی بھیک مانگتے رہیں گے۔

پاکستان ہم لوگوں نے بنایا لیکن کچھ لوگ اس کو اپنی جاگیر سمجھتے ہوئے ہمارے سروں پر مسلط ہو گئے ہیں جو اس ملک میں اسلام کا نفاذ نہیں چاہتے، جبکہ جو لوگ اسلام پسند اور امن پسند ہے، وہ اسلام کے قوانین کو اس ملک میں نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ اب فیصلہ ہم علماء کو کرنا ہے کہ ہم کس فریق کا ساتھ دیں۔ اس کے بعد جو سب سے بڑا چیلنج سندھ اور کراچی میں درپیش ہے، وہ حکومتی رٹ کا نہ ہونا ہے۔ سندھ میں ایک بے اختیار اور بے بس انتظامیہ ہے اور تھانہ کلچر رائج ہے، یعنی جس کی لاٹھی اس کی بھینس۔ سندھ میں جو وڈیرے ہیں، ہاری ان کے ظلم کی چکی میں پس رہے ہیں، جبکہ کراچی میں جو حکمران ہیں، وہ بلیک میلنگ کرتے ہیں۔ اگر سندھ میں امن چاہیے تو حکومت وانتظامیہ کو اپنی رٹ قائم کرنا ہوگی۔ حکومت کی ذمہ داری ہے کہ وہ شہریوں کی جان و مال کی حفاظت کرے، لیکن صوبہ سندھ میں نہ جان کی حفاظت ہے، نہ مال کی اور نہ عزت کی۔

گزشتہ چند برسوں کے دوران 25 ہزار افراد قتل ہو چکے ہیں۔ 12 مئی کا سانحہ آپ کے سامنے ہے، جب وکلاء کو زندہ جلا دیا گیا۔ دکانوں اور مارکیٹوں کو نذرِ آتش کیا گیا۔ لوگوں سے مختلف طریقوں سے بھتے لیے جاتے ہیں اور انہیں لوٹا جاتا ہے۔ جنگل کا ایسا قانون ہے کہ امن اور حکومت دونوں نظر نہیں آتیں۔ لہٰذا اس چیلنج پر قابو نہ پایا گیا تو یہ کراچی اور سندھ نہ جانے کس کے ہاتھوں میں چلا جائے گا، یہ آپ بھی جانتے ہیں اور میں بھی۔ حدیثِ مبارکہ میں ہے کہ ''مظلوم کی مدد کرو۔'' قیامِ امن کے لیے اس حدیث پر عمل کرنا ہوگا۔ وہاں ظالم کی تو مدد کی جارہی ہے، لیکن مظلوم کی دادرسی نہیں ہو رہی۔

تیسرا چیلنج یہ ہے کہ سندھ کے اندر امریکہ اور بھارت کے ایجنٹ فعال ہیں اور بہت مضبوط ہو چکے ہیں۔ یہ بات میڈیا میں آچکی ہے۔ یہ جیکب آباد کا ائیر پورٹ کس لیے تعمیر کیا جارہا ہے، نیٹو کی سپلائی کس بندرگاہ سے ہو رہی ہے۔ کیا ہم سب کی آنکھیں بند ہیں کہ ہم اپنے ملک کو لٹتا ہوا دیکھ رہے ہیں۔ چوتھا بڑا چیلنج سندھ میں اور خاص کر کراچی میں لسانیت اور عصبیت ہے۔ مجھے خطرہ ہے کہ اگر ان عوامل کا سدباب نہ کیا گیا تو پڑوسی پڑوسی کے گھر میں گھس کر اس کے بیوی بچے کو قتل تا پھرے گا۔ یہ لسانیت اور عصبیت کی لعنت کراچی میں سرایت کر چکی ہے اور جو لوگ فرقہ وارانہ یا مذہبی شدت پسندی کی بات کرتے ہیں، کیا ان لوگوں کو لسانی وعصبی شدت پسندی نظر نہیں آتی؟ اس تصادم میں لوگ لُٹ رہے ہیں، قتل ہو رہے ہیں اور کسی کا جان و مال اور آبرو محفوظ نہیں۔ کبھی سندھ کارڈ اور کبھی مہاجر کارڈ کا استعمال۔ بلیک میلنگ کر کے اپنے مطالبات منوائے جارہے ہیں، لیکن عوام کے درد کا کوئی پرسانِ حال نہیں ہے۔ کراچی میں اگر بھتہ لیا جاتا ہے تو اندرونِ سندھ میں جاگیردارانہ نظام اور اغواء وڈکیتیوں کی وارداتیں ایک بڑا چیلنج ہے۔ میں اندرون سندھ میں سانگھڑ سے کراچی تک رات کا سفر نہیں کر سکتا کہ اغواء کر لیا جاؤں گا اور چند لاکھ میرے عوض

مانگے جائیں گے اور نہ دیے گئے تو قتل کر دیا جاؤں گا۔ جاگیردارانہ نظام میں ہاری غلاموں سے بدتر زندگی گزارتے ہیں اور مجھے خطرہ ہے کہ اگر دولت کی یہ غیر مساوی تقسیم جاری رہی تو ایک دن ہاری ان جاگیرداروں پر ٹوٹ نہ پڑیں۔ امیر امیر تر اور غریب غریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ اگر ان سب چیلنجز کا سدباب کریں گے تو انشاءاللہ امن قائم ہو جائے گا۔

پانچواں چیلنج بے روزگاری اور مہنگائی ہے۔ اس بے روزگاری کی وجہ سے سینکڑوں نہیں بلکہ لاکھوں نوجوان ڈگریاں لے کر در بدر پھر رہے ہیں اور مایوسی کے باعث وہ یا تو ڈاکو بنتے ہیں یا پھر دہشت گرد تنظیموں کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ ان حالات میں امن کہیں نظر نہیں آئے گا۔ اگر آپ ان نوجوانوں کو ملازمتیں نہیں دیں گے تو وہ کیا کریں گے۔ آخری بات جو میں کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ نظام تعلیم طبقاتی ہے۔ میڈیا اور روشن خیال تعلیمی ادارے ایسے بچے تیار کر رہے ہیں جو مذہبی تعلیمات سے کوسوں دور ہیں۔ بقول شاعر؛

وہی جام سیاست ہے وہی دستور ساقی ہے

بلوچستان کا تناظر؛ علامہ اکبر حسین زاہدی

دنیا میں کوئی قوم اور معاشرہ ایسا نہیں جو بحرانوں یا مصیبتوں سے نہ گزرا ہو۔ قوموں اور ملتوں پر مصیبتیں اور بحران آتے رہتے ہیں۔ بحران تین طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک بحران دشمن لے کر آتا ہے، تاکہ مخالف قوم اور ملک سے جڑے اہداف حاصل کر سکے۔ دوسرا بحران رب تعالیٰ آزمائش کے لیے لیکر آتے ہیں۔ جیسا کہ ارشاد ہے: ''ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے، خوف کے ذریعے اور بھوک کے ذریعے۔'' یعنی اللہ تعالیٰ بھوک اور پیاس کے ذریعے قوموں کو آزماتا ہے، تاکہ اس قوم کے اندر چھپی صلاحیتیں اجاگر ہو جائیں۔ تیسرا بحران انسان خود اپنے ہاتھوں سے پیدا کرتا ہے۔ یعنی بحر و بر میں جو مصیبتیں اور آزمائشیں آپ دیکھ رہے ہیں، یہ خدا کی طرف سے نہیں ہیں بلکہ انسان کی پیدا کردہ ہیں۔ اب دیکھنا یہ ہے کہ مملکت پاکستان کے اندر جو سیاسی، مذہبی، لسانی اور صوبائیت کا بحران ہے، اور جو ملک کے اندر مذہبی، سیاسی اور لسانی دہشت گردی ہو رہی ہے، ان کی وجوہات کیا ہیں اور ان کا ذمہ دار کون ہے۔ ہمارے معاشرے میں اگر کہیں پر کسی ادارے میں کوئی خرابی ہے تو لوگ اس کی وجہ جانے بغیر فوراً اس پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔ سانحہ خروٹ آباد میں ایف سی کو بُرا بھلا کہا گیا، ایف سی والے آسمان سے اتر کر تو نہیں آئے ہیں۔ پولیس افغانستان یا امریکہ سے تو نہیں لائی گئی ہے۔ یہ ہمارا اور آپ کا حصہ ہیں۔ معاشرے کے افراد سے ہی پولیس بنتی ہے اور اسی معاشرے کے بچے فوج میں بھرتی ہوتے ہیں۔ تو جیسا کھیت ہوتا ہے، مولی بھی ویسی ہی ہوتی ہے۔ ہمیں اس بات پر غور کرنا ہے کہ ہمارا معاشرہ اس نہج تک کیسے پہنچا؟ کیا ہمارا معاشرہ پہلے سے ہی ان خصوصیات کا حامل تھا، ہرگز نہیں۔ کیونکہ اگر یہ خرابیاں پہلے سے ہمارے معاشرے میں پائی جاتیں تو یہ معاشرہ وجود میں ہی نہ آتا۔ ہمارے آباؤ اجداد وہ ہیں جنہوں نے اس مملکت کی بنیاد رکھی۔ لہٰذا ہم یہ دیکھتے ہیں کہ پروردگار انسانوں کو آزمانے اور ان کی صلاحیتوں کو اجاگر کرنے کے لیے ان کو آزمائش سے دوچار کرتا ہے۔ اب کہاں سے یہ معلوم ہوگا کہ کون سی مصیبت اللہ کی طرف سے ہے، اور کون سی مصیبت ہماری اپنی نازل کردہ ہے اور کون سی مصیبت دشمن کی طرف سے ہے۔ ہمارے پاس ایک ہی معیار ہونا چاہیے کہ ہم احکام خداوندی پر من وعن عمل کریں، اور یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہ مصیبتیں اللہ کی طرف سے آزمائش کے طور پر آتی ہیں۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں؛

تندیٔ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب
یہ تو چلتی ہے تجھے اونچا اڑانے کیلئے

اور اس طرح زلزلے آتے ہیں، سیلاب آتے ہیں۔ آپ نے دیکھا کہ زلزلہ اور سیلاب آیا تو قوم نے کس قدر اتحاد و یگانگت کا مظاہرہ

کیا۔ میں حکومتوں کی بات نہیں کرتا، لیکن لوگوں نے فراخدلی سے سیلاب زدگان کی مدد کی۔ جب پروردگار کی طرف سے اس طرح کی مصیبتیں آتی ہیں تو قومیں اپنے آپ کو ان مصیبتوں سے نکال لیتی ہیں اور ہمیشہ جرأت مند قوم سرخرو ہوتی ہے، لیکن کبھی مصیبتیں انسان کی اپنی پیدا کردہ بھی ہوتی ہیں۔ ہم بحران خود پیدا کرتے ہیں اور کبھی کبھار اس بحران سے نکل جائیں تو خوش ہوتے ہیں کہ ہم نے اپنے آپ کو اس بحران سے نکالا۔

بھائیو! بحران تو آپ نے خود پیدا کیا تھا اور اب اسے حل کر لیا تو اس میں خوشی کی کیا بات ہے اور نہ ہی یہ خردمندی کی علامت ہے۔ خوش تو تب ہونا چاہیے کہ دشمن تمہارے لیے جال بنے اور تم اس میں نہ پھنسو۔ پاکستان کو جن بحرانوں کا سامنا ہے، آیا وہ ہمارے اپنے پیدا کردہ ہیں یا دشمن کے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ یہ دشمن کے پیدا کردہ بحران ہیں لیکن دشمن نے ہمیں استعمال کیا اور ہمیں دلدل میں پھنسا کر خود پیچھے ہٹ گیا۔ ہمارے اربابِ سیاست اور ہمارے علماء قوم کو اس دلدل سے کیسے نکالتے ہیں، یہ ہمارے اور آپ کے عقل وشعور کے امتحان کا وقت ہے۔ اس مرحلے پر ہمیں قوم کو واضح راستہ دکھانا چاہیے۔ ہمارے سامنے بہت ساری اقوام کی ایسی مثالیں موجود ہیں، جن کے اوپر جنگیں مسلط کی گئیں، لیکن انہوں نے اپنے آپ کو ان سے بچایا اور ترقی کی۔ ایسی جنگیں ہم پر مسلط نہیں کی گئیں، لیکن ہمیں آپس میں لڑایا گیا ہے جس کے باعث ہم ایک دوسرے کا خون بہا رہے ہیں۔ لہٰذا مذکورہ تین قسم کے بحرانوں میں سے آخری بحران میں دشمن نے ہمیں پھنسا دیا ہے اور ہم نے اس بحران سے خود نکلنا ہے۔ آسمان سے فرشتے نازل ہو کر ہمیں بحران سے نہیں نکالیں گے۔

جب ہم صوبہ بلوچستان کے بارے میں سنتے ہیں تو لرزہ اور خوف طاری ہو جاتا ہے کہ یہاں پر ہر طرح کی دہشت گردی ہو رہی ہے۔ کوئی ایسا جرم نہیں ہے جو بلوچستان میں نہ ہو رہا ہو۔ بلوچستان رقبے کے لحاظ سے پاکستان کا سب سے بڑا صوبہ ہے، لیکن صوبے کے دور دراز میں ایسے علاقے بھی ہیں، جہاں آپ کو ایک ہزار سال پہلے کا منظر نظر آئے گا۔ یہ علاقے بنیادی انسانی ضروریات سے محروم ہیں، لیکن کوئی بھی ان محرومیوں کی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ صوبے والے وفاق پر الزام لگاتے ہیں اور وفاق والے صوبے پر الزام لگاتے ہیں۔ کوئی یہ تسلیم کرنے پر تیار نہیں کہ اس تالاب میں ہم سب ننگے ہیں۔ اہلِ بلوچستان محروم ہیں، لیکن انہیں محروم کیوں رکھا گیا؟ ظاہر کہ محرومی تشدد کو جنم دیتی ہے اور حقوق جب سلب کیے جاتے ہیں تو قومیں بغاوت پر اُتر آتی ہیں۔ لیکن دوسری طرف بلوچستان میں پشتون بھی آباد ہیں لیکن وہ اپنی محرومیوں کا اس قدر اظہار نہیں کرتے، جس قدر بلوچ کرتے ہیں۔

یقیناً بلوچوں کے ساتھ ظلم ہوا ہے اور صوبے میں ہر فریق کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے۔ سانحہ خروٹ آباد سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ کوئی ایسا جرم نہیں جو بلوچستان میں نہ ہوا ہو، ان حالات میں علماء کو کیا کردار ادا کرنا چاہیے؟ یہ الگ بات ہے کہ اس طرح کا ماحول بنانے میں خود علماء کا کتنا کردار رہا ہے۔ ہمیں اپنے آپ کو بری الذمہ قرار نہیں دینا چاہیے۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ سیاست دانوں کا کام ہے، فوج اور پولیس کا کام ہے یا یہ فلاں کا کام ہے، لیکن اس جرم میں ہم سب برابر کے شریک ہیں۔ اگر ہم یہ سمجھتے ہیں کہ بلوچستان میں صورتحال یکدم تبدیل ہو جائے تو ایسا ممکن نہیں ہے، کیونکہ بلوچستان بھی پاکستان کا حصہ ہے اور خیبر پختونخوا بھی۔ جب تک مرکز سے کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، صوبائی سطح پر تبدیلی ناممکن ہے۔ پروردگار ہمارے احبابِ اختیار کو عقل وشعور دے کہ وہ ملکی وقومی مفادات کو مدنظر رکھیں، وگرنہ صورتحال تبدیل نہیں ہوگی۔ یہ میرے اور آپ کے بس کی بات نہیں، کیونکہ آپ کا اور میرا تعلق مسجد سے ہے اور یہ آپ بہتر طور پر جانتے ہیں کہ مسجد میں کتنے لوگ آتے ہیں۔ علماء کو اس خوش فہمی میں مبتلا نہیں ہونا چاہیے کہ ہم ملکی صورتحال کو تبدیل کر دیں گے۔ زیادہ سے زیادہ ہمارا کردار 20 سے 25 فیصد تک ہو سکتا ہے۔ صورتحال یہ ہے کہ ہمیں یہ بھی علم نہیں کہ اربابِ اختیار کے پاس ملک کی تقدیر بدلنے کا کتنا اختیار ہے، یہ جو رونا روتے ہیں کہ ہمارے پاس اختیارات نہیں ہیں، انہیں یہ اختیارات کیسے حاصل ہوں گے کہ بے یقینی کی موجودہ صورتحال سے نکلا جا سکے۔ لیکن وہ بنیادی عوامل جن کے ذریعے ہم اپنے آپ کو ان بحرانوں سے نکال سکتے ہیں، ان میں سب سے اہم یہ ہے اور جیسا کہ ہمارے علمائے کرام فرماتے ہیں کہ اس ملک میں نظام مصطفیٰ ﷺ اور اسلامی نظام نافذ ہو، لیکن اس

کے لیے اسی طرح کا ماحول ہونا چاہیے۔ کیا اس طرح کا ماحول یہاں ہمارے ہاں موجود ہے؟ اس کے لیے ضروری ہے کہ مستحکم سیاسی نظام کو چلتے رہنا چاہیے۔ معاشروں میں تبدیلی راتوں رات نہیں آتی۔ آپ اخوان المسلمین کا تجزیہ کریں جو مصر میں انقلاب کے داعی ہیں، تو پتا چلتا ہے کہ مصر میں کس قدر تاخیر سے تبدیلی آئی ہے۔ اسی طرح انقلاب ایران بھی علماء کی دو، اڑھائی سو سال کی محنت کا ثمر ہے۔ اس لیے علمائے کرام کو غلط فہمی کا شکار نہیں ہونا چاہیے، پروردگار ہم سب کو منبر و محراب ٹھیک طریقے سے سنبھالنے کی توفیق دے۔

کشمیر کا تناظر؛ مولانا قاضی محمود الحسن اشرف

ارشاد تبارک وتعالیٰ ہے؛ ''بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہے۔'' اور نبی کریم ﷺ کا فرمان ہے کہ ''علماء انبیاء کے وارث ہیں۔''

علمائے کرام خواہ آج کے زمانے کے ہوں یا 1450 سال پہلے کے، اللہ کی دھرتی پر حضرت محمد ﷺ کی عالی شان وراثت کے حامل ہیں۔ آپ ﷺ نے جو نظام زندگی انسانیت کیلئے پیش کیا، اس نظام کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ تعالیٰ نے ہر دور میں علماء کرام پر عائد کی ہے۔ حضور ﷺ کے 23 سالہ دور نبوت میں ایک لاکھ 44 ہزار لوگوں نے آپ سے استفادہ کیا اور وہ دین جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کی کامل نجات اور انسانی رہنمائی کی تمام چیزیں حضور ﷺ کے ذریعے پیش فرمائیں، ان کی حفاظت صحابہ کرامؓ اور اہل بیتؓ کے ذریعے فرمائی۔ اسلام کے اس مثالی دور کی تعلیمات اور اس کے نظائر کو مدنظر رکھ کر ہی ہم آنے والے چیلنجز سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔

معزز علمائے کرام!

جب حضور ﷺ نے مکہ مکرمہ سے مدینہ منورہ میں ہجرت فرمائی تو مدینہ میں اسلامی ریاست معرضِ وجود میں آئی۔ سب سے پہلی اسلامی ریاست مدینہ منورہ ہے جسے آپ ﷺ نے قائم فرمایا اور پھر آپ ﷺ کے اس دنیا سے پردہ فرمانے کے بعد خلفائے راشدین نے اس امانت کو نہ صرف اگلی نسلوں تک منتقل کیا بلکہ حضور ﷺ کے لیے اللہ تعالیٰ نے مختلف مواقع پر بشارتیں دی تھیں، ان بشارتوں کی تکمیل سیدنا حضرت صدیق اکبرؓ، سیدنا حضرت فاروق اعظمؓ، سیدنا حضرت عثمان غنیؓ اور سیدنا حضرت علیؓ کے دور خلافت میں ہوئی اور یہی وجہ ہے کہ حضرت محمد ﷺ نے امت میں تفرقے سے بچنے کے لیے جہاں ایک طرف اپنی سنت کو معیار قرار دیا، وہاں خلفائے راشدین کی سنت اور ان کے دور حکومت اور نظام حکومت کو بھی معیار قرار دیا۔

حضور ﷺ کا یہ فرمان ''علیکم بسنتی وسنۃ خلفائے راشدین'' اس پورے نظام کو آئینی تحفظ بھی فراہم کرتا ہے اور حجت بھی قرار دیتا ہے، گویا کہ دنیا میں کسی بھی موقع پر جب بھی کسی اسلامی ریاست کو بہتر سے بہتر بنانے کی کوشش کی جائے گی، تو آپ ﷺ کی تعلیمات اور خلفاء راشدین کے دورِ حکومت سے استفادہ کیے بغیر ایسا ناممکن ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ خلافت عثمانیہ کے سقوط کے بعد مسلمانوں اور اکابر علماء نے جو جدوجہد کی تھی، اسی جدوجہد کے نتیجے میں پاکستان معرض وجود میں آیا اور یہ کلمے کی بنیاد پر قائم کیا گیا۔ لیکن بدقسمتی سے جب پاکستان وجود میں آیا تو اس وقت برطانیہ کی تربیت یافتہ اشرافیہ اور جاگیرداروں کے ٹولے نے پاکستان کے اصل مقاصد کے حصول کی جانب بڑھنے کی بجائے اسے اپنی جاگیر بنالیا اور اس کے بعد 64 سالوں میں جو خرابیاں پیدا ہوئیں، وہ آپ کے سامنے ہیں۔ اس تناظر میں پاکستان کا سب سے بڑا مسئلہ علمائے کرام کے کردار کے حوالے سے درپیش ہے، کیونکہ وہ اللہ کی دھرتی پر حضور ﷺ کے وارث ہیں، جیسا کہ آپ ﷺ نے اشاد فرمایا؛ ''علماء انبیاء کے وارث ہیں۔ جو اللہ کی دھرتی پر کسی عالم باعمل کی زیارت کرتا ہے تو وہ پیغمبر کی صحبت سے مستفید ہوتا ہے۔'' جہاں پر علمائے کرام کی فضیلت بہت زیادہ ہے، وہاں پر ان کی ذمہ داریاں بھی بہت ہیں۔ علمائے کرام کو جو سب سے بڑا چیلنج درپیش ہے، وہ خارجی نہیں داخلی ہے۔ علمائے کرام کو حضور ﷺ کے نائب ہو

سیمینار میں شریک علماء

علامہ سید جواد ہادی

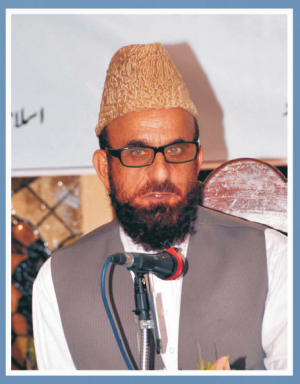

مفتی منیب الرحمان

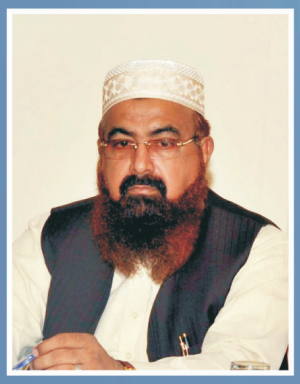

مولانا یٰسین ظفر

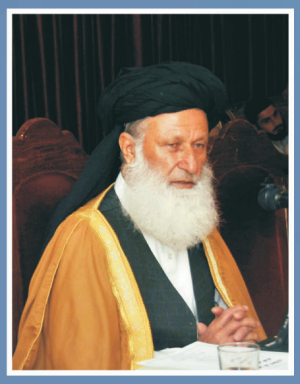

مولانا محمد خان شیرانی

پیر مدثر شاہ

ڈاکٹر راغب نعیمی

ڈاکٹر فرید پراچہ

قاری محمد حنیف جالندھری

سیمینار میں شریک علماء

ڈاکٹر ابوالحسن شاہ

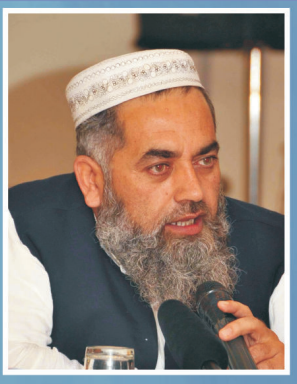
مولانا عطاء اللہ شہاب

ڈاکٹر سید محمد نجفی

ڈاکٹر قبلہ ایاز

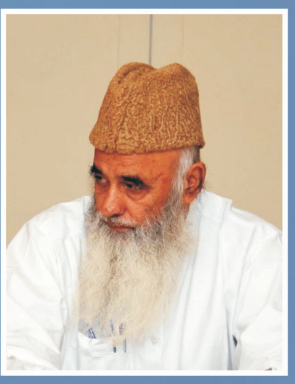
مولانا محمد سلفی

مفتی محمد زاہد

علامہ سید فرحت حسین شاہ

ڈاکٹر خالد مسعود

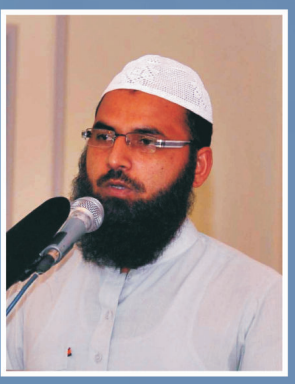
مولانا ضیاء اللہ نقشبندی

علامہ اکبر حسین زاہدی

مفتی محمد رفیق

خورشید ندیم

علامہ علی بخش سجادی

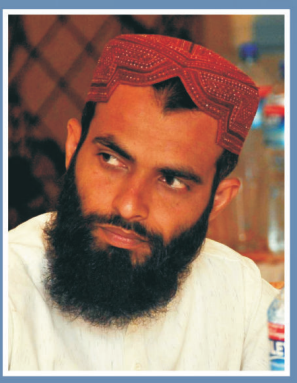
علامہ محمد یونس قاسمی

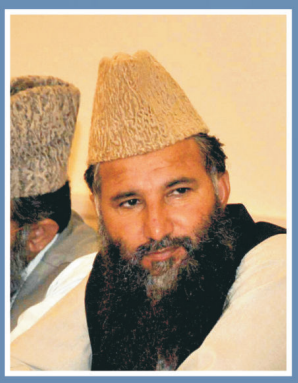
مولانا فضل الرحمان مدنی

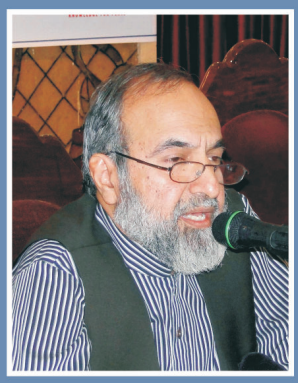
ڈاکٹر خالد ظہیر

سیمینار میں شریک علماء

علامہ عمار خان ناصر

علامہ آغا امین شہیدی

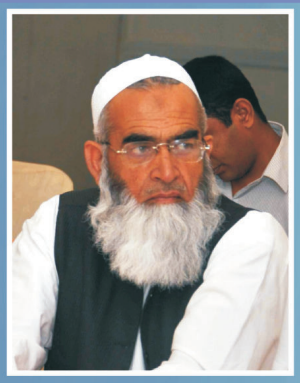
مولانا انوار الحق حقانی

صاحبزادہ سید صفدر شاہ گیلانی

مولانا خالد ضیاء

قاری ضمیر اختر منصوری

مولانا عبدالقدوس محمدی

مولانا انیس الحسنین

ڈاکٹر عبدالناصر لطیف

علامہ اصغر حسین عسکری

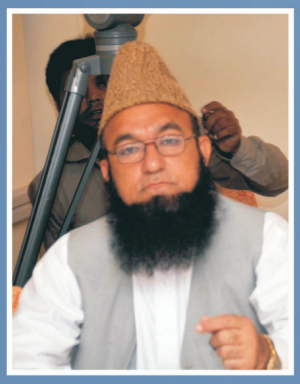
مولانا عبدالاکبر چترالی

مولانا عبدالحق ہاشمی

مولانا مسعود بیگ

مولانا شمشاد حسین

مولانا بابر حسین بابر

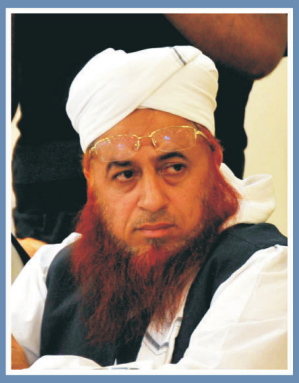
قاضی محمود الحسن اشرف

سیمینار میں شریک علماء

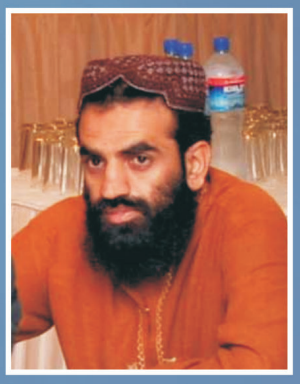

مولانا امجد سعید

مولانا زکریا ذاکر

پیر فاروق بہاؤالحق شاہ

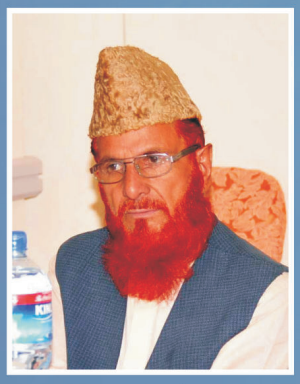

مولانا محمد حیات قادری

نے کے ناطے جو کچھ کرنا چاہیے، وہ نہیں کیا جارہا اور جب کچھ نہیں کیا جارہا تو یقیناً معاشرے میں تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔ جیسا کہ انسانی جسم میں دل مرکزی حیثیت کا حامل ہے، اگر دل درست ہوگا تو اس کے اثرات انسان کے پورے جسم پر پڑیں گے۔ اسی طرح علماء کرام اپنی ذمہ داریوں اور فرائض سے عہدہ برآ ہونے کیلئے سنجیدہ کوشش فرمائیں گے تو یقیناً اس کے مثبت اثرات معاشرے پر پڑیں گے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ علمائے کرام نے کسی زمانے میں بھی حکومت کے اختیارات یا اقتدار ہونے کے باوجود معاشرے کی اصلاح نہیں کی۔ کیا یہ تاریخ کا حصہ نہیں ہے کہ علمائے کرام اور مشائخ عظام تن تنہا ایک علاقے سے دوسرے میں آئے اور انہوں نے مخلصانہ طور پر کوششیں کی اور ان کی کوششوں سے لاکھوں لوگ اسلام کی دولت سے مالا مال ہوئے اور ایک صالح معاشرہ وجود میں آیا۔ قرآن پاک میں حضورؐ کی بعثت کے مقاصد حضرت ابراہیمؑ کی بیت اللہ کی تعمیر کے بعد جو دعا ہے، اس میں موجود ہیں اور اس کے ساتھ ساتھ دوسرے مقامات پر جہاں حضورﷺ کی بعثت کو اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کیلئے ایک احسان قرار دیا اور فرمایا؛'' **لقد من الله على المؤمنين اذ بعث فيهم رسول** ''۔

جب تک ہم اپنے دینی مدارس اور مساجد میں ان چار مقاصد کی وراثت کی ذمہ داریاں پوری نہیں کریں گے، تب تک ہم معاشرے میں اصلاح کی جتنی بھی کوششیں کریں گے تو وہ ٹھیک نہیں ہوں گی۔ کشمیر اور پنجاب کے حوالے سے موضوعات کی جو تقسیم کی گئی ہے، میں نے اس پر بہت غور کیا کہ اگر یہ جغرافیہ کے لحاظ سے کی گئی ہے تو زیادہ قابل فہم نہیں ہے۔ کشمیر کی جغرافیائی کیفیات میں جائے بغیر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ کشمیر میں اسلام صوفیا کی دعوت وتبلیغ کے نتیجے میں پہنچا اور کشمیر ہمیشہ پرامن رہا ہے اور وہاں سے ہمیشہ محبت اور انسانیت کے احترام کا پیغام عام کیا جاتا رہا۔ میں اس بات سے بالکل اتفاق نہیں کرتا کہ پاکستان جن چیلنجز کا سامنا کررہا ہے، وہ افغانستان کے مسئلہ یا کسی اور وجہ سے ہیں۔ بنیادی طور پر یہ چیلنجز برصغیر پر انگریزوں کے قبضے اور خلافتِ عثمانیہ کے سقوط سے پیدا ہوئے۔ ہم ہمیشہ اس کی نسبت مدرسہ، مسجد یا کسی خاص مکتبہ فکر یا جماعت کی طرف کردیتے ہیں، حالانکہ انگریز کا بنیادی اصول ہے کہ 'لڑاؤ اور حکومت کرو'۔ واشنگٹن سے آکر افغانستان میں حملہ کرنے والا جارح ظلم وتشدد کے پہاڑ توڑتا ہے تو اس کے ردِعمل میں وہاں کا مسلمان مزاحمت کرتا ہے تو ہمیں اس کا الزام متاثرہ فریق پر عائد کرنے کی بجائے جارح کو ذمہ دار ٹھہرانا چاہیے، جو ہم نہیں کررہے۔

دوسری گزارش یہ ہے کہ ہمیں اپنے مدارس اور مساجد کو علم اور امن کے گہوارے بنانے کی ضرورت ہے، جیسا کہ وہ حضورﷺ کے دورِ رسالت اور خلافتِ راشدہ میں تھے۔ جہاں ہم اس طرح کے سیمینار اسلام آباد میں منعقد کرواتے ہیں، وہاں ان کو مختلف صوبوں میں منعقد کروانا چاہیے اور جہاں یہ ہوٹلوں میں ہوتے ہیں، وہاں یہ عوامی مقامات پر ہوں اور جو گفتگو ہم یہاں کرتے ہیں، وہ گفتگو ہم اپنے مدرسے میں بھی کریں۔ اگر ہم یہاں پر محبت سے بات کریں، لیکن اپنے مدرسوں اور مساجد میں بدعات اور فتوؤں کی بات کریں اور ایک دوسرے پر الزام لگانا شروع کر دیں، تو یہ نہ تو حضورﷺ کی مبارک سیرت ہے اور نہ خلفائے راشدین کی تعلیمات کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ وہ ان تمام علمائے کرام کو مل بیٹھ کر ان مسائل پر غور وفکر کرنے اور ان سے عہدہ برآ ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔

صدارتی خطبہ: علامہ سید فرحت حسین شاہ

اس سیشن میں بحمدِ تعالیٰ ہمارے جن مقتدر احباب نے گفتگو فرمائی، ان میں علامہ راغب نعیمی صاحب نے پنجاب کے تناظر میں بیان کیا کہ پنجاب کی اہمیت گنجان آباد شہروں کے باعث بڑھ جاتی ہے، جبکہ یہاں پولیس کی ناگفتہ بہ حالت، طبقاتی تفاوت، بالائی اور زیریں پنجاب کا طرز زندگی میں فرق، حصول انصاف میں حائل مشکلات اور سماجی سطح پر ترقی کے معدوم ہونے کا ذکر کیا۔ اسی طرح سے انتہا پسند طبقہ جو کہ جہاد کے

نام پر غلط تصورات قائم کیے ہوئے ہے، ان کے خلاف آواز اٹھانے کی تجاویز دیں اور قانون، اخلاق اور مساوات کی بنیاد پر معاشرہ قائم کرنے کی جانب توجہ مبذول کروائی۔

ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب نے خیبر پختونخوا اور قبائلی علاقوں کے حوالے سے بتایا کہ یہ دنیا کے پیچیدہ ترین علاقے ہیں اور اس خطے میں مذہبی اور فرقہ ورانہ ہم آہنگی تاریخ کا حصہ ہے، لیکن کچھ ہی عرصہ کے بعد سرد جنگ کے باعث فرقہ واریت کا مسئلہ پیدا ہو گیا، پھر انہوں نے وار لابی اور پیس لابی کا ذکر کیا اور کہا کہ ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہوگا کہ ہم نے کس لابی کے ساتھ چلنا ہے۔ انہوں نے اس بات کی بھی نشاندہی کی کہ خیبر پختونخوا میں ایسے علماء ہیں جن کے تعلقات طالبان سے ہیں اور طالبان ان کی بات مانتے ہیں۔ اگر وہ علماء خلوص نیت سے اپنا کردار ادا کریں تو یہ معاملہ حل کرنے میں بہت زیادہ معاونت مل سکتی ہے۔

علامہ زاہدی صاحب نے بھی بہت مدلل انداز میں گفتگو فرمائی کہ قوموں پر بحران آتے رہتے ہیں۔ ایک بحران اللہ کی طرف سے آتا ہے، ایک بحران انسان خود پیدا کرتا ہے اور ایک دشمن کی طرف سے آتا ہے۔ آپ نے ان کی تفصیل بیان کرتے ہوئے کہا کہ دشمن نے ہمارے خلاف سازشیں کی ہیں، لیکن اس میں کچھ ہمارا اپنا بھی حصہ شامل ہے۔ آپ نے بلوچوں کے ساتھ ہونے والے ظلم کا تذکرہ بھی کیا۔

میں نے اپنے صدارتی خطبہ کے لیے جو آیت تلاوت فرمائی، اس میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: ''اور ہم نے انسان کے لیے امام بنائے جو ہمارے حکم سے ہدایت کا کام کرتے ہیں۔'' یہ تو ہم سب جانتے ہیں کہ انبیاء کرام ہدایت کا کام کرتے رہے اور ان کے بعد یہ کام علمائے کرام کے سپرد ہوا۔ اگر ہم تاریخ کا مطالعہ کریں تو ہم دیکھتے ہیں کہ جب بھی کسی مسلک یا خاص نظریے کو نقصان پہنچانا ہوتا ہے تو سب سے پہلا حملہ اس کے عقائد پر کیا جاتا ہے۔ پھر جب عقائد پر حملہ ہوتا ہے تو یہ انسان کو انتہا پسندی و تفرقہ بازی پر اکساتے ہیں۔ کیونکہ عقائد عقد سے ہے جس کا مطلب گرہ یا جوڑ ہے۔ اگر کسی جوڑ کو توڑ دیا جائے تو صاف ظاہر ہے کہ افراتفری بڑھ جائے گی۔ اب پہلا حملہ ہمارے عقائد پر کیا گیا جس کی وجہ سے بہت زیادہ دوریاں آئی ہیں اور دوسری بات جدید دور کے مسائل ہیں، ان مسائل کا حل قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کرنا وقت کا اہم تقاضا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ اس وقت سب سے اہم مسئلہ فکری ابہام کا ہے۔ ایک فرد خودکش حملے کر کے یہ سمجھتا ہے کہ وہ جنت میں جائے گا۔ اسے ایسی آیات اور احادیث سکھائی جاتی ہیں۔ علمائے کرام کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اس دور کے مسائل ہیں کا حل اجتماعی سطح پر لوگوں کے سامنے پیش کریں۔ اس کے علاوہ بھی دورِ جدید کے بہت سے ایسے مسائل ہیں، جیسا کہ اس وقت دنیا عالمگیریت کے اثرات کے زیرِ اثر ہے اور لوگ دین پر یہ اعتراض کرتے ہیں کہ کیا دین ان مسائل کا حل پیش کر سکتا ہے؟ اس کے لیے علمائے کرام کو اپنا کردار ادا کرنا ہے اور مزید یہ کہ جب کسی دین کو کمزور کرنا ہوتا ہے تو اس کی اقدار اور دینی شعائر کو نقصان پہنچایا جاتا ہے۔ دینی اقدار کیا ہیں، مثلاً سر ڈھانپنا، برقعہ اوڑھنا، مساجد، مدارس اور مزارات وغیرہ۔ اب جس نے ریش مبارک رکھی ہو، اس کو شک کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے۔ مسجد اور مدرسے کو شک کی نگاہ سے دیکھا جا رہا ہے۔ یہ اسلامی شعائر کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے، اگر ان تمام معاملات کو دیکھا جائے تو ان کی وجہ سے لوگ دین سے دور ہوتے ہیں۔

علماء نے سب سے پہلا کام عقائد کے بگاڑ کی اصلاح کا کرنا ہے۔ دوسرا کام جدید دور کے مسائل کے حل قرآن و حدیث کی روشنی میں پیش کر کے فکری ابہام کو دور کرنا ہے، تاکہ ہم ان تمام مسائل سے چھٹکارا پا سکیں۔ میں اس واقعہ پہ اپنی بات ختم کروں گا کہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ ایک مرتبہ ایک راستے سے گزر رہے تھے تو ایک ضعیف اور کمزور شخص کو دیکھا جو کراہ رہا تھا۔ آپ اس کے پاس گئے، اس کا سانس اکھڑ رہا تھا۔ اس کا جسم گرد سے اٹا ہوا اور ہڈیوں کا ڈھانچہ تھا، قریب تھا کہ اس کی جان نکلتی، آپ اس کے قریب گئے۔ اسے اوپر اٹھایا اور سینے سے لگایا۔ کپڑے وغیرہ جھاڑے اور چند ساعتوں بعد اسے دیکھا تو ایک بہت ہی نورانی چہرے والا نوجوان آپ کے سامنے کھڑا تھا۔ آپ نے پوچھا تو کون ہے اور پہلے تیری حالت کیا تھی؟ اس نے کہا؛ عبدالقادر میں تیرے نانا کا دین ہوں۔ لوگوں نے میری طرف دیکھنا چھوڑ دیا تھا۔ آپ نے اتنا کام کیا کہ مجھے ایک

نئی زندگی مل گئی۔ آج ہمیں دین اسلام کیلئے بہت زیادہ محنت کرنے کی ضرورت ہے۔ دن رات سوچ بچار کرنے کی ضرورت ہے۔ اس کیلئے ایک سیمینار نہیں بلکہ کئی سیمینار منعقد کرانے کی ضرورت ہے۔ ہمارے درمیان یہ جو قلبی اور مسلکی دوریاں ہیں اور ہمارے عقائد کی دوریاں ہیں، اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہمارے حالات سنور جائیں تو علمائے کرام کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کرنا چاہیے اور مناظروں پر مکمل پابندی عائد ہونی چاہیے، کیونکہ علمی مناظروں کا انعقاد ممکن نہیں۔ اگر کوئی علمی مناظرہ ہو تو اس کا حکومت کو علم ہونا چاہیے۔ اس طرح حکومت کا ایک مستند ادارہ ہونا چاہیے جو اختلافی مسائل کو سنے اور ان کا اجتماعی حل پوری امت کے سامنے رکھے۔ کفر اور واجب القتل کے فتاویٰ جاری کرنے والے علماء کے خلاف قانون سازی کی جائے اور ان کو سخت سے سخت سزا دی جانی چاہیے۔ نفرت، انتہا پسندی اور تفرقہ بازی پر مبنی جملہ لٹریچر اور سی ڈیز ضبط ہونی چاہئیں، اور آئندہ ان کی اشاعت اور تیاری پر پابندی عائد ہونی چاہیے۔ اصل میں تجاویز تو دی جاتی ہیں لیکن ہمارے ملک میں آج تک کسی کو سزا نہیں دی گئی، جس کی وجہ سے سماجی برائیاں بڑھتی چلی جارہی ہیں۔ اگر چند ایک لوگوں کو سزا مل جائے تو پھر اس مسئلے کا حل نکل سکتا ہے۔ دوسرا یہ کہ خون کو خون سے دھونے کی کوشش کی جارہی ہے، حالانکہ جب خون بہہ جائے تو اس کو خون سے نہیں دھویا کرتے، پانی سے دھویا جاتا ہے۔ زخم پر مرہم لگائی جاتی ہے تب جا کر وہ زخم مندمل ہوتا ہے، لیکن یہاں پر جو نظام قائم ہے، وہ ہم سب کے سامنے ہے۔ بارود کے بدلے میں بارود ہے۔ ظلم کے بدلے میں اور زیادہ ظلم روا رکھا جارہا ہے۔ آج جتنے علمائے کرام نے یہاں خطاب کیا، انہوں نے ہر طرح کی معاشرتی، معاشی، ملکی و قومی برائیوں کی نشاندہی کی اور یقیناً ان کا حل بھی آپ کے سامنے پیش کیا ہے۔

وقفۂ سوالات

رائے: (مولانا فضل الرحمان مدنی) پرامن اور متوازن معاشرے کے قیام اور علماء کے کردار کے موضوع پر تجاویز مدلل انداز میں پیش کی جاچکی ہیں۔ میں عملدرآمد کے لیے ایک تجویز دینا چاہتا ہوں، تاکہ گفتن، نشستن اور برخواستن والا سلسلہ نہ ہو۔ عمل درآمد کیلئے میری تجویز یہ ہے کہ جس طرح عالم کفر کے تمام ممالک مل کر پاکستان کو توڑنے کی سازش کررہے ہیں اور پاکستان کا دشمن پاکستان کے اندر داخل ہوچکا ہے، ان حالات میں ہمیں بہت تیزی سے کام کرنا ہے۔ ایک وفاق المدارس کے تمام ادارے ملک کے تمام علاقوں میں اس طرح کے پروگرام منعقد کریں اور ان پروگراموں کے اندر پاکستان کی دیگر سیاسی، تجارتی، عوامی تنظیموں و اداروں، میڈیا، وکلاء اور تمام طبقات کو شریک کیا جائے، تاکہ فوری طور پر ان کی فکر میں انقلاب پیدا ہو۔ ان تک ہمارا پیغام پہنچے اور دوسرا یہ کہ حکومت، فوج، ادارے اور عوام مل کر ملک کو درپیش مسائل کے حل کے لیے سعی کریں۔ ایک طریقہ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وفاق المدارس کے یہ علمائے کرام ملی یکجہتی کونسل کو فعال کرنے کے لیے سنجیدہ کوشش کریں، تاکہ فرقہ ورانہ ہم آہنگی کو فروغ دیا جاسکے۔

سوال: آج کی اس نشست میں پرامن معاشرے کے قیام اور اس کو درپیش مسائل پر جتنی بھی تقاریر ہوئی ہیں، ان سے یہ پتا چلتا ہے کہ ملک کو درپیش چیلنجز مذہبی نوعیت کے کم ہیں اور ان کا زیادہ تعلق سیاست اور حکومت سے ہے۔ علمائے کرام اس حوالے سے کیا کردار ادا کرسکتے ہیں، کیونکہ ایسا سیاسی اتحاد ہوتا ہوا نظر نہیں آتا کہ علماء کو مسندِ اقتدار ملے تو کیا علمائے کرام مسند ارشاد کے ذریعے اصلاح معاشرہ کے حوالے سے اپنی ذمہ داریاں پوری کرسکتے ہیں؟

جواب: (علامہ سید فرحت حسین شاہ) علماء ارشاد و تبلیغ اور واعظ کا کام تو اپنی جگہ کررہے ہیں اور اپنی کاوشیں جاری رکھے ہوئے ہیں، لیکن اس کے ساتھ عمل کی ضرورت بھی ہے۔

سوال: ڈاکٹر قبلہ ایاز صاحب سے میرا سوال ہے کہ آپ نے فرمایا کہ افغانستان میں اقوام متحدہ کی خدمات حاصل کرنی چاہئیں، اس کے ساتھ ہی آپ کہتے ہیں کہ علمائے کرام کو اپنا کردار بھرپور طریقے سے سرانجام دینا چاہیے۔ اگر افغانستان کے معاملات میں اقوام متحدہ کو شامل کیا جائے گا تو علمائے کرام اپنا کردار ادا نہیں کرسکیں گے، اس حوالے سے بڑی عجیب صورتحال درپیش ہے، کیونکہ قبل ازیں علمائے کرام نے طالبان کے ساتھ مذاکرات کیے تھے اور بعض رپورٹس ملی ہیں، جن میں یہ بتایا گیا ہے کہ علماء کرام افغانستان میں طالبان کے پاس گئے اور پاکستان میں فعال تحریک طالبان (ٹی ٹی پی) کے نمائندہ حضرات سے مذاکرات کرنے کی کوشش بھی کی، لیکن ان کی بات نہیں مانی گئی۔ خود آپ نے بھی فرمایا کہ سخت مؤقف کے حامل پتھری اور پنج پیری گروپ معرض وجود میں آچکے ہیں تو یہ بڑی گنجلک سی بات لگتی ہے۔ ان عوامل کے باعث میں سمجھتا ہوں کہ ان حالات میں علمائے کرام کا کوئی کردار نہیں ہے۔ آپ کی اس بارے میں کیا رائے ہے؟

جواب: (ڈاکٹر قبلہ ایاز) شاید میں اپنی گفتگو کو درست تناظر میں پیش نہیں کرسکا۔ میں نے پتھری گروپ کا افغانستان کے حوالے سے ذکر نہیں کیا۔ ڈیرہ اسماعیل خان میں ایک مذہبی گروپ فعال ہے، جس کا جہادِ افغانستان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ افغانستان میں مذاکرات کے حوالے سے میں نے جو بات کی، اس حوالے سے میں گزارش کرتا ہوں کہ خواہشات کی دنیا مختلف ہے، لیکن حقائق مختلف ہیں، مثلاً جنگ عظیم اول اور جنگ عظیم دوئم کا فیصلہ بھی مذاکرات پر ہی ہوا اور افغانستان کا مسئلہ بھی میز پر ہی حل ہونا ہے۔ اگر یہ طے نہیں ہوا تو اس علاقے کے سیاسی طالبعلم کی حیثیت سے میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت بڑا نقصان ہوگا۔ ان حالات میں دو طرح کے گروہ فعال ہیں، ایک گروہ چاہتا ہے کہ امریکہ کو اسی طرح سے بھگا دیا جائے، جیسا کہ روس کو بھگایا گیا تھا اور دوسرا گروپ یہ کہتا ہے کہ مذاکراتی عمل کے ذریعے معاملات کو حل کیا جائے۔ اب ظاہر ہے کہ مذاکرات کیلئے کسی نہ کسی کو درمیان میں آنا ہے اور ہم اقوام متحدہ سے لاکھ شکایت کریں، لیکن جس طرح میں نے گزارش کی کہ حقائق کی دنیا الگ ہے، کوئی بھی بڑے سے بڑا بین الاقوامی معاملہ طے کرنا ہو تو وہ اقوام متحدہ کے بغیر طے نہیں ہوسکتا۔ امریکہ اس میں خفت اور سبکی محسوس کرے گا لیکن اگر اقوام متحدہ ایک نمائندہ منتخب کرے جس طرح کسی زمانے میں روس کے مسئلے کے حل کے لیے اقوامِ متحدہ کے نمائندے آتے رہے ہیں۔ میں نے تجویز پیش کی تھی کہ اگر اس نمائندے کا تعلق ترکی یا ملائیشیا سے ہو تو وہ زیادہ مفید ثابت ہوگا کیونکہ ترکی پر طالبان کا بھی اعتماد ہے اور ترکی نیٹو کا حصہ بھی ہے، جبکہ اقوام متحدہ کو بھی ترکی پر بہت اعتماد ہے۔ اب خیبر پختونخوا اور فاٹا میں کچھ ایسے علماء ہیں جو طالبان کے ساتھ مذاکرات کرسکتے ہیں اور وہ طالبان کو اس بات کیلئے آمادہ کرسکتے ہیں کہ وہ مذاکراتی عمل کے ذریعے اپنی مزاحمت کو جاری رکھیں، کیونکہ جب تک افغانستان میں تمام فریقوں کو نمائندگی نہیں دی جاتی اور قومی مفاہمت کی حکومت قائم نہیں ہوتی تو عالمی سطح پر اس طرح کی حکومت کو قبول نہیں کیا جائے گا۔

سوال: آپ نے کہا کہ ایک پیس لابی ہے اور ایک وار لابی ہے اور امریکی صدر اوباما پیس لابی کا حصہ ہیں۔ کیا امریکہ میں بھی پاکستان کی طرح فوج اپنی مرضی چلاتی ہے۔ کیا ایسا کوئی ثبوت ہے کہ امریکی صدر اوباما پیس لابی کا حصہ ہیں؟

جواب: (ڈاکٹر قبلہ ایاز) دیکھیں! میں صدر اوباما یا جنرل پیٹریاس کو یہاں نہیں لاسکتا۔ معاشرتی علوم میں آپ نے قرآئن کو دیکھنا ہوتا ہے اور معاشرے کا مطالعہ کرنا ہوتا ہے اور یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ معاشرے کس طرح چلتے ہیں۔ امریکی معاشرہ اور سماج کس طرح چلتا ہے، اس حوالے سے امریکہ میں لابنگ کا بڑا اہم کردار ہے۔ جس طرح ہم یہاں ایم پی اے یا ایم این اے کو رشوت دیتے ہیں، اسی طرح کی رشوت ادھر بھی ہوتی ہے لیکن اس کو رشوت نہیں لابنگ کہا جاتا ہے۔ مثلاً ہم جنس پرستوں کی لابی ہے۔ ہم جنس پرستوں کی لابنگ ایک بڑا گروپ 'کاکس' کرتا ہے۔ امریکہ میں ایک نظام قائم ہے۔ آپ یہ نہ کہیں کہ امریکہ کی فوج پاکستان کی طرح ہے۔ میں آپ کو بتاؤں کہ کسی حد تک ایسا ہی ہے اور وہاں پر فوج کے اپنے مفادات ہیں جو کہ وار لابی کی ہم نوا ہے۔ اس کی ایک مثال میں آپ کو دیتا ہوں کہ سکیورٹی گیٹس جو کبھی صدر اور وزیراعظم کیلئے استعمال ہوتے تھے، اب ہر جگہ ان کو نصب کیا جاتا ہیں۔ ان سکیورٹی گیٹس کی فروخت سے حاصل ہونے والا منافع وار لابی کو جاتا ہے۔ وار لابی یہ سکیورٹی گیٹس فروخت

کرتی ہے۔اسی طرح وار لابی قبائل میں بھی کام کرتی ہے، وہاں ہونے والی اغواء برائے تاوان کی وارداتوں کے پس پردہ وار لابی ملوث ہوتی ہے، جیسا کہ ہمارے ایک وائس چانسلر کو اغواء کیا گیا اور انہیں 10 کروڑ تاوان ادا کر کے رہا کروایا گیا۔ وار لابی کی طرح جنگی معیشت (وار اکانومی) بھی ہے جو اپنا کام کرتی ہے۔ افغانستان میں وار اکانومی ہے اور افیون کی کاشت کا معاوضہ حامد کرزئی کا بھائی وصول کرتا ہے۔ اس کا فائدہ اسی میں ہے کہ جنگ جاری رہے۔ دنیا میں ایک بہت بڑی وار لابی کام کر رہی ہے، بدقسمتی سے ہمیں اس کا ادراک نہیں ہے۔ اب ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ ہمیں وار لابی کا ساتھ دینا ہے یا پیس لابی کا، اور پیس لابی کا حصہ بننا بہت مشکل کام ہے اور وار لابی کا حصہ بننا بہت آسان۔ وار لابی کا حصہ بن کر آپ ہیرو بھی بن جاتے ہیں اور آپ کا بڑا استقبال بھی ہوتا ہے اور آپ کو پھول بھی پہنائے جاتے ہیں، لیکن پیس لابی کا حصہ بننے سے بہت سی تکالیف کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ ہماری عورتیں بیوہ بن رہی ہیں اور نوجوان شہید ہو رہے ہیں۔ اس لیے ہمیں ضرورت ہے کہ ہم پیس لابی کا حصہ بنیں۔

سوال: جہاں تک ہماری معلومات ہیں، تحریک طالبان پاکستان ایک گروپ نہیں ہے۔ یہاں امریکہ، اسرائیل اور بھارت کے طالبان بھی فعال ہیں اور خفیہ ایجنسیوں اور افغانستان کے طالبان بھی ہیں تو ان کے ساتھ کیسے مذاکرات ممکن ہو سکتے ہیں۔ پاکستانی طالبان اور افغان طالبان کے ساتھ مذاکرات تو کریں گے لیکن جو غیر ملکی ایجنسیاں یہاں کام کر رہی ہیں، ان کے ساتھ مذاکرات کا کیا طریقہ کار ہو سکتا ہے؟

جواب: (ڈاکٹر قبلہ ایاز) میرا خیال ہے کہ میں اپنا مافی الضمیر صحیح طور پر نہیں سمجھا سکا۔ میں افغانستان کے طالبان کی بات کر رہا تھا، جب افغانستان کا مسئلہ حل ہو جائے گا تو باقی مسئلے از خود حل ہو جائیں گے۔

پُرامن معاشرے کے قیام میں علماء کا کردار

(تیسری نشست)

صدارت: ڈاکٹر خالد مسعود

مذہبی سکالر، سابق سربراہ اسلامی نظریاتی کونسل

مقررین

مولانا یٰسین ظفر، ناظمِ اعلیٰ، وفاق المدارس السّلفیہ

ڈاکٹر ابوالحسن شاہ، وائس پرنسپل دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ

علامہ سید جواد ہادی، مہتمم مدرسہ عارف الحسینی، پشاور

علامہ عمار خان ناصر، نائب مہتمم الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ

آغاز گفتگو: ڈاکٹر خالد مسعود

قبل اس کے کہ میں مقررین کو دعوتِ خطاب دوں، افتتاحی نشست کو ملا کر اس وقت تک اس سیمینار کی تین نشستیں ہو چکی ہیں۔

پہلی نشست میں پاکستان میں امن کی صورتحال پر بات کرتے ہوئے مولانا شیرانی صاحب نے اس بات کی جانب اشارہ کیا کہ امن وامان کی بدحالی کی وجہ وحدت کی کمی ہے۔ سیاسی وحدت اور مذہبی وحدت دونوں ہی ضروری ہیں۔ دوسری اور تیسری نشست میں امن کی صورتحال کے مختلف پہلوؤں پر بات ہوئی۔ پاکستان کی جو متنوع جغرافیائی صورتحال ہے، اس میں ہم نے دیکھا کہ سب مسائل ایک طرح کے ہیں۔ اگرچہ جغرافیائی صورتحال کی وجہ سے بعض جگہ پر مسائل زیادہ ہیں اور بعض جگہ پر کم ہیں۔ آج جو چیز بہت کھل کے سامنے آئی ہے، وہ یہ کہ ہمارے علماء صرف مدرسوں، منبروں اور محرابوں تک ہی محدود نہیں بلکہ پاکستان کے حالات پر بھی نظر رکھتے ہیں۔ ان کے تجزیے غیر جانبدارانہ اور علمی نوعیت کے ہوتے ہیں۔ اب یہ چوتھی نشست ہے۔ پہلے ہم نے پاکستان میں امن کی صورتحال کا جائزہ لیا اور اس کے مختلف پہلوؤں پر بات کی۔ اب خاص طور پر ہم اس بات کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس تمام صورتحال میں علماء کی کیا ذمہ داری بنتی ہے؟ اور یہ سوال بھی اُبھرتا ہے کہ کیا ان حالات کو اس نہج تک پہنچانے میں ہمارے مذہبی طبقات کا کوئی کردار ہے؟ اور یہ کہ امن کی صورتحال کو برقرار رکھنے میں علماء کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟ یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اس نشست میں جو لوگ علماء کے کردار پر بات کریں گے، وہ خود ایسے حضرات ہیں جنہوں نے اپنے عمل سے اور اپنی تحریروں سے بھی گاہے بگاہے اس موضوع پر بات کی ہے۔

مولانا یٰسین ظفر

"کنتم خیر امة اخرجت للناس تأمرون بالمعروف و تنهون عن المنکر."

حاضرینِ مجلس آج کی اس نشست کا موضوع ہے "پرامن معاشرے میں علماء کا کردار"، کل سے ہم ملتے جلتے موضوعات پر گفتگو سنتے آئے

ہیں اور علماء سے ہم نے بہت کچھ سیکھا ہے۔ اس اعتبار سے ہماری گفتگو میں تکرار بھی ہوسکتی ہے۔ میری تقریر میں بھی اگر آپ کوئی تکرار محسوس کریں تو دراصل اسے تذکیر سمجھیں۔ انسان فطرتاً پرامن اور خوشگوار زندگی کا خواہاں ہے۔ وہ بدامنی اور بے چینی سے نفرت کرتا ہے۔ امن کی خواہش ایک بڑا ہی خوبصورت جذبہ ہے اور یہ تمام انبیاء کا مشن ہے اور انہوں نے اس کے لیے دعائیں بھی کیں۔

جب بیت اللہ کی تعمیر مکمل ہوئی تو حضرت ابراہیمؑ نے دعا فرمائی ''اے اللہ! اس شہر کو امن عطا فرما۔'' امن کے لیے یہ خواہش اور تمنا تمام انبیاء کی تھی اور علماء چونکہ وارث الانبیاء ہیں، اس لیے جس مقصد کے لیے انبیاء مبعوث ہوئے، وہی مقصد آج ہمارا بھی ہونا چاہیے، لہٰذا ہمیں وہی امور سرانجام دینے چاہئیں جو انبیاء دیتے آئے۔ انبیاء کا بنیادی مقصد اللہ کے پیغام اور تعلیمات کو لوگوں تک پہنچانا اور ان کی زندگی کو آخرت کے لیے بہتر بنانا تھا۔

دعوتِ دین کے لیے پرامن ماحول ہی سازگار ہوتا ہے۔ جس قدر امن ہوگا، اتنی ہی دعوت زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچے گی۔ ہم دیکھتے ہیں کہ جب حضورﷺ نے مکہ مکرمہ میں دعوت کا آغاز کیا تو کفار کا جیسا بھی رویہ رہا، مگر آپﷺ نے امن کیلئے ہی اپنی جدوجہد جاری رکھی اور کبھی بدامنی پیدا نہیں ہونے دی۔ اللہ رب العزت نے قریش مکہ کو بھی اسی لئے مخاطب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اس رب کے گھر کی عبادت کرو جو بھوک سے تمہیں کھلاتا ہے اور خوف سے امن دلاتا ہے''۔

خوف ایک ایسی کیفیت ہے کہ اس میں انسان کچھ بھی نہیں کر پاتا۔ گھبراہٹ اور خوف میں وہ کوئی بھی خطرناک قسم کا قدم اٹھا سکتا ہے، لہٰذا دعوت تبلیغ میں انبیاء اور علماء کے کردار کیلئے امن کا ہونا ضروری ہے۔ نبی کریمﷺ نے شعب ابی طالب میں جانا پسند فرمالیا تھا، لیکن مکہ کا ماحول خراب نہیں ہونے دیا۔ اسی طرح آپﷺ نے اپنے اصحاب کو حبشہ کی طرف ہجرت کرنے کی اجازت دے دی لیکن مکہ میں بدامنی پیدا نہیں ہونے دی، حتیٰ کہ حضورﷺ خود بھی ہجرت کرکے مدینہ منورہ تشریف لے گئے۔ اس لیے کہ خیر کے تمام سرچشمے امن سے پھوٹتے ہیں۔ کوئی بھی زندگی ہو، وہ امن سے ہے اور امن ہے تو زندگی ہے۔ اگر امن ہے تو خوشحالی ہے اور دعوت وتبلیغ بھی ممکن ہے۔ سیرت نبیﷺ اور تاریخ اسلام کا مطالعہ کریں تو اس میں ہمیں متعدد ایسے واقعات ملتے ہیں جن سے یہ پتہ چلتا ہے کہ اسلام کا فروغ اور دعوت وتبلیغ حالتِ امن میں ہی ہوئی، نہ کے جنگ وجدل اور فساد کے حالات میں ممکن ہوئی۔

میں دو مثالیں آپ کے سامنے رکھتا ہوں جن میں سے ایک صلح حدیبیہ کا ایک اہم ترین واقعہ ہے جو سن چھ ہجری میں ہوا۔ نبی کریمﷺ نے بعثت سے لے کر صلح حدیبیہ تک امن کے لیے بہت زیادہ تکالیف اٹھائیں۔ جنگ وجدل بھی ہوا، لیکن اتنے لوگ مسلمان نہیں ہوئے اور پھر جب آپﷺ نے صلح حدیبیہ میں کفار سے دس سال تک جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کیا تو مسلمانوں کو امن وسکون میسر آیا۔ پھر آپﷺ نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور لوگوں تک اسلام کی دعوت پہنچائی۔ امن کے ماحول کے باعث لوگوں کو موقع ملا کہ وہ اسلام پر غور وفکر کرسکیں۔ انہوں نے اس دعوت پر لبیک کہا اور نتیجہ یہ ہوا کہ دو سال بعد جب مکہ والوں نے معاہدے کو ختم کیا تو رسولﷺ فتح مکہ کے موقع پر مکہ تشریف لے گئے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر حضورﷺ کے جانثار صرف پندرہ سو تھے، لیکن دو سالوں بعد جب آپﷺ دوبارہ مکہ تشریف لے گئے تو یہ تعداد 10 ہزار تک پہنچ جاتی ہے، یعنی دو برسوں میں مسلمانوں کی تعداد میں جتنا اضافہ ہوا، وہ سترہ سالوں میں نہیں ہوسکا۔ امن کی کیفیت میں جو کام ہوتا ہے، وہ سکون واطمینان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اسی طرح آپ دیکھتے ہیں کہ جب افریقہ کی فتح ہوئی تو ایک بربری قبیلہ جو مسلمانوں کی دعوت کو قبول نہیں کرتا تھا، بلکہ ہمیشہ برسرِ پیکار رہتا تو اس وقت مصر کے گورنر عبدالعزیز بن عبدالملک نے موسیٰ بن مصاعد کو اس علاقے کا عامل اور لشکر کا امیر مقرر کردیا۔ انہوں نے بڑی بصیرت کے ساتھ پہلے ان علاقوں میں امن قائم کیا اور پھر داعی اور مبلغین کو وہاں بھیجا، جنہوں نے وہاں جاکر لوگوں کو اسلام کی دعوت سے روشناس کیا اور اسلام کی تہذیب سے آگاہ کیا ور امن کے چند مہینوں میں بہت سے لوگوں نے اس دعوت کو قبول کیا اور وہی بربری قبائل جو مسلمانوں

کے مقابل تھے، اب ان کے ہراول دستے میں شامل تھے۔ اسی طرح انڈونیشیا اور ملائشیا میں اسلام جنگ وجدل کے ذریعے نہیں پہنچا بلکہ وہاں تاجر اور علماء پُرامن ماحول میں گئے اور اسلام کی تعلیمات کو پیش کیا، اور یہ تمام لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے۔ میرا استدلال صرف اتنا ہے کہ امن کے ماحول میں جتنا کام ہوسکتا ہے، وہ کسی اور حالت میں نہیں ہوسکتا۔ علماء کا بنیادی کام دعوت وتبلیغ ہے، اس لیے ان کی اولین ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ امن کے ماحول کو سازگار بنائیں اور بدامنی کا خاتمہ کریں اور امن کو فروغ دے کر اپنی تبلیغ کو لوگوں تک پہنچائیں۔

حضراتِ گرامی!

موجودہ عہد میں علماء کا کردار دو پہلوؤں سے نظر آتا ہے، ایک انتظامی ہے اور دوسرا اخلاقی۔ انتظامی امور میں تو علماء کو اپنی کوئی ذمہ داری نظر نہیں آتی کیونکہ علماء اقتدار میں نہیں آتے، اور نہ ہی ان کو کوئی بڑی انتظامی ذمہ داری ملتی ہے۔ اس کے باوجود امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے زمرے میں ان کی ذمہ داری بہرحال ہے کہ وہ انتظامیہ کی مدد کریں، لیکن اخلاقی طور پر علماء پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی تربیت کریں۔ علماء کا یہ کردار سب سے اہم ہے۔ ایک معاشرے کی تشکیل میں ہر فرد کا کردار ہوتا ہے، اگر علماء ایک ایک فرد پر توجہ دیں اور ان میں مکارمِ اخلاق پیدا کریں تو بلاشبہ معاشرہ میں امن قائم ہوجائے گا۔ اس ضمن میں چند امور پر خصوصی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔ اگر علماء اپنا کردار ذمہ داری سے ادا کریں تو معاشرے میں امن فروغ پائے گا۔ پہلی بات عقیدۂ توحید اور اس کا فروغ ہے۔ اس اعتبار سے جتنے انبیاء آئے، انہوں نے عقیدۂ توحید کی دعوت دی۔ جب تک توحید نہیں ہے، امن قائم نہیں ہوسکتا۔ اس لئے کہ جہاں دو خدا ہوں گے وہاں پر امن کیسے قائم ہوسکتا ہے؟ دوسرا، رسالت ﷺ کا اقرار اور اس کا اتباع اور اس کے ساتھ فکرِ آخرت ہے، اور یہ ہمارے عقائد میں شامل ہے۔ فکرِ آخرت بہت بڑے جرائم سے روکتی ہے اور انسان کو امن کی جانب راغب کرتی ہے۔ تیسری بات یہ کہ علماء کو چاہیے کہ وہ نسلی برتری اور قوم پرستی کے رجحان کی حوصلہ شکنی کریں، کیونکہ یہ بدامنی کے فروغ میں نمایاں کردار ادا کرتا ہے اور جب یہ رجحان کسی بھی قوم میں آجاتا ہے، تو وہاں پر امن قائم نہیں ہوسکتا۔ لوگ اپنی چودھراہٹ قائم کرنے کے لیے کوئی بھی قدم اٹھا سکتے ہیں۔ علمائے کرام کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کو لوگوں تک پہنچائیں اور انہیں سمجھائیں کہ اسلام کی نظر میں سب برابر ہیں۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''ہم سب آدم کی اولاد ہیں۔'' اس اعتبار سے ہمارے حقوق بھی برابر ہیں۔ علاوہ ازیں علمائے کرام مسلمانوں میں دولت کی طمع، لالچ اور اس کی ہوس کا خاتمہ کریں، کیونکہ یہ بدامنی میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ لوگ دولت کی خاطر کیا کچھ نہیں کرتے ہیں اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کی وجہ سے یہ سب کچھ ہوتا ہے۔ میں یہ سمجھتا ہوں کہ دولت کی منصفانہ تقسیم سے مراد عہد کی پاسداری ہے۔ ہمارے ہاں عہد شکنی ایک عام رواج بن گیا ہے جو بدامنی کو فروغ دینے کا سبب بن رہا ہے۔ رسول ﷺ کی حدیث ہے: ''کوئی قوم اگر وعدہ خلافی کرتی ہے یا عہد توڑتی ہے تو اللہ ان کے درمیان اس طرح کی صورت پیدا کردیتا ہے کہ ان کے درمیان قتل و غارت ہوتی ہے۔'' یہ قتل وغارت بدامنی کے ماحول میں ہی ہوتی ہے۔ اس لیے ہم دیکھتے ہیں کہ صلح حدیبیہ کے موقع پر جو کچھ آپ ﷺ نے فرمایا اور جو وعدہ کیا، اس کو پورا کیا۔ آج اس اَمر کی ضرورت ہے کہ علمائے کرام لوگوں میں عہد کی پاسداری کی اہمیت اجاگر کریں۔ اسی طرح انصاف کی فراہمی صرف عدالتوں تک ہی محدود نہیں ہونی چاہیے بلکہ ہر جگہ انصاف کی بالادستی ہونی چاہیے۔ ہمیں اپنے عہدوں کے ساتھ بھی انصاف کرنا چاہیے۔ خواہ کوئی پولیس میں ہے یا فوج میں یا پھر وزیر ہے، وہ اپنے عہدے کے ساتھ انصاف کرے۔ اس طرح ہی جہالت کا خاتمہ ہوگا۔ یہ علماء کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ لوگوں کو تعلیم دیں اور اگر وہ ایسا کرتے ہیں تو یقیناً معاشرہ تعلیم یافتہ ہوسکتا ہے، اس طرح بدامنی نہیں ہوگی۔ آخر میں چند تجاویز آپ کے گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔

پہلی تجویز یہ ہے کہ ہم بلاامتیاز انسانیت کا احترام کریں۔ یہ امن کے فروغ کیلئے ضروری ہے۔ اس کی اسوہ رسول ﷺ سے بہترین مثالیں ملتی ہیں۔ اس طرح صحت مند ماحول میں باہمی مکالمہ بہت ضروری ہے۔ مختلف طبقات کا آپس میں میل جول اور گفتگو امن کا ماحول پیدا کرنے میں

بہت اہم کردار ادا کرتی ہے۔ اسی طرح اختلاف رائے کو مخالفت کا ذریعہ نہ بنایا جائے۔ ہمارے سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ایک جیسی نہیں ہوتی۔ میرا نقطۂ نظر کچھ بھی ہوسکتا ہے، لیکن اس کی وجہ سے میرے ساتھ کوئی مخاصمت کرے تو یہ درست نہیں، بلکہ اختلاف رائے کو ایک نعمت سمجھنے سے انسان کے لیے غور وفکر کی بہت ساری راہیں نکل آتی ہیں۔

اس طرح برداشت کے کلچر اور اعلیٰ اخلاقی قدروں کا فروغ امن کے قیام کے لیے بہت ضروری ہیں۔ علماء کی ذمہ داری ہے کہ وہ لوگوں کو یہ بات باور کروائیں کہ وہ اپنے ہاتھ اور زبان پر قابو رکھیں۔ اس طرح معاشرے میں جو فرقہ ورانہ تعصب ہے، بدقسمتی سے اس کی ذمہ داری ہمیشہ علماء پر عائد کردی جاتی ہے، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ ہم نے دیکھا ہے کہ علماء کی اکثریت جب بھی کسی مسئلہ پر بات کرتی ہے تو اتحاد واتفاق سے بات ہوتی ہے۔ ہوسکتا ہے ہمارے طبقہ میں ایسے لوگ ہوں جو انتشار پیدا کرتے ہوں، لیکن ان لوگوں کو سب پر قیاس کردینا کسی بھی طرح درست نہیں۔ ہمارے درمیان بہت سے امور مشترک ہیں اور ہم بہت سارے معاملات پر متفق ہوسکتے ہیں، مثال کے طور پر لوگوں کی فلاح، تعلیم، صحت کی سہولیات اور پانی کی فراہمی، یہ وہ کام ہیں جنہیں ہم لوگ یکجا ہوکر کرسکتے ہیں۔ کیا یہ ضروری ہے کہ ہم اپنے کام کا آغاز ان اختلافات سے کریں جو کہ صدیوں سے حل نہیں ہوسکے؟

ڈاکٹر ابوالحسن شاہ

کسی بھی معاشرے کے لیے امن ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتا ہے، خواہ وہ اسلامی معاشرہ ہو سیکولرازم، سوشلزم یا ہندومت کا معاشرہ ہو۔ اگر معاشرے میں امن نہیں ہے تو خواہ وہ اسلامی معاشرہ ہی کیوں نہ ہو، درست طور پر اپنے ثمرات لوگوں تک نہیں پہنچا سکتا اور لوگ اس سے مستفید نہیں ہوسکتے۔ پرامن معاشرے کے قیام میں علماء کا کردار کیا ہے، اس کے لیے علمائے کرام پر دو قسم کی ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں۔ ایک وہ ذمہ داریاں ہیں جن کا تعلق علمائے کرام سے براہ راست ہے اور دوسری وہ جن کا تعلق علمائے کرام سے براہِ راست نہیں ہوتا، لیکن وہ اس حوالے سے مؤثر کردار ادا کرسکتے ہیں۔ پُرامن معاشرے کے قیام کی راہ میں حائل وہ رکاوٹیں جو مذہبی نوعیت کی ہیں، ان کو دور کرنے کے لیے علمائے کرام پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنا کردار ادا کریں۔ مسلک کی تقسیم کی وجہ سے معاشرے میں بدامنی کی جو فضاء پیدا ہوتی ہے، اس کے سدباب کے لیے ضروری ہے کہ علمائے کرام دوسرے مسالک کے وجود کو برداشت کرنے کے لیے وسعت ظرفی کا مظاہرہ کریں۔ یہ حقیقت ہے کہ ہر مسلک نے اپنے افکار ونظریات پر ہی قائم رہنا ہے، لیکن دوسرے مسلک کے ساتھ لاکھ اختلافات کے باوجود یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ان کا وجود ایک حقیقت ہے۔ اس حوالے سے بدامنی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب تقریر وتحریر میں بے اعتدالی قائم ہوجائے۔ تکفیر اور قتل کے فتوؤں کی نوعیت بہت ہی سنگین ہے۔ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالنے اور دوسرے مکاتبِ فکر کے اکابرین کو برا بھلا کہنے سے بھی بدامنی جنم لیتی ہے۔ اس کے خاتمے لیے ضروری ہے کہ کوئی بھی مسلک اپنے سچا ہونے کی دلیل اس کو نہ سمجھے کہ دوسروں کا اس کے نقطۂ نظر سے متفق ہونا ضروری ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ تحریر وتقریر میں اعتدال اور احتیاط سے کام لیا جائے تاکہ پرامن معاشرے کا قیام ممکن ہوسکے۔ مسلک کی تقسیم کی وجہ سے بدامنی کی صورت قائم ہونے کا دوسرا سبب طریقۂ تدریس وتقریر ہے۔ ہر مسلک کا مدرس وخطیب اپنی تقریر وتحریر میں طلبہ کے ذہنوں میں یہ بات راسخ کرتا ہے کہ وہی سچا ہے، باقی سب جھوٹے ہیں اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔ اس طرزِ عمل سے معاشرے میں نفرت جنم لیتی ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ طلبہ اور سامعین کے ساتھ ساتھ علماء کرام اپنے ذہنی افق کو وسعت دیں۔

قرآن وسنت کے دلائل کو اپنے مسلک کے مطابق کرنے کی بجائے اپنے مسلک کو قرآن وسنت کے تابع اور طلباء وسامعین کو اختلاف

رائے برداشت کرنے کا خوگر بنایا جائے۔ سامعین سے میری مراد مساجد میں خطباء کی تقاریر سننے والے لوگ ہیں۔ یہ خطباء اپنے سامعین کو بتائیں کہ اختلاف رائے ہر جگہ ممکن ہے، لیکن جارحیت پر اتر آنا مستحسن نہیں۔ اسی طرح علمائے کرام مسلک کی تعلیم دینے کی بجائے دین اسلام کی تعلیم کو عام کریں۔ اگر ان باتوں پر اختلاف رائے کیا جائے جو کہ ضروریات دین میں سے ہیں، جیسا کہ ناموسِ رسالت ﷺ، عظمت صحابہؓ، احترام اہلبیت وصالحین، تو معاشرے سے بدامنی کو ختم نہیں کیا جا سکتا۔ بزرگانِ دین کے بارے میں نازیبا کلمات کسی صورت میں برداشت نہیں ہو سکتے، لہٰذا امن کے قیام کے لیے ان ہستیوں کا احترام ضروری ہے۔ علماء پر دوسری ذمہ داری یہ عائد ہوتی ہے کہ وہ معاشرے کو پرامن بنانے کیلئے ظلم و ناانصافی، طبقاتی تفریق، ظلم و لاقانونیت، عدم مساوات اور کرپشن کے تدارک کے لیے سعی کریں۔ یقینی اَمر یہ ہے کہ ان مسائل کو حل کرنے کی ذمہ داری براہِ راست علمائے کرام پر عائد نہیں ہوتی۔ لیکن علماء کرام اس حوالے سے اپنا مؤثر کردار ادا کر سکتے ہیں، چونکہ علماء کی آواز لوگوں تک پہنچتی ہے اور ان کی اکثریت علماء کا احترام بھی کرتی ہے اور ان کو اپنا رہبر بھی تسلیم کرتی ہے۔ اس ضمن میں علماء اپنے خطبوں کے موضوعات کو روایتی انداز سے نکال کر وسعت دیں اور ان مسائل پر قرآن وسنت کی روشنی میں عوام کی رہنمائی کریں، جن میں اخلاقی بیماریاں غیبت، کینہ، تہمت، بغض، جھوٹ اور خاندانی معاملات شامل ہیں۔ ان معاشرتی و اخلاقی معاملات میں علمائے کرام اپنے طلباء و سامعین کی مؤثر رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اسی طرح لاقانونیت اور مہنگائی کے خاتمہ کے لیے علماء رہنمائی کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ علمائے کرام کے پاس ایک ایسا پلیٹ فارم ہونا چاہیے، جس کے ذریعے کیے گئے مطالبات حکومت تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائے۔ قادیانیوں کو اقلیت قرار دلوانے اور ناموس رسالت ﷺ کے تحفظ کے قانون کو ترمیم سے بچانے کے لیے علماء نے متفقہ کوششیں کی۔ اس لیے اگر مسائل پر اکٹھے ہو کر متفقہ رائے سے کامیابیاں حاصل کی جا سکتی ہیں تو لاقانونیت، مہنگائی اور کرپشن کے خاتمے جیسے مسائل پر بھی علمائے کرام کی متفقہ آواز حکومت کو اقدامات کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔ PIPS کا یہ پلیٹ فارم بھی ایسا ہے کہ جہاں سے مختلف مسالک کے لوگ متفقہ لائحہ عمل تیار کر کے اپنی رائے کو حکومت کے ایوانوں تک پہنچا سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ ذاتی مفاد کا نہیں بلکہ پرامن معاشرے کے قیام کا ہے۔ ضرورت اس اَمر کی ہے کہ ایسے سیمینار نہ صرف ہوٹلوں میں بلکہ مدارس اور دیگر تعلیمی اداروں میں بھی منعقد کروائے جائیں جس سے بین المدارس روابط بھی استوار ہو سکتے ہیں اور اتحاد و اتفاق کی فضا بھی قائم ہو سکتی ہے۔

علامہ سید جواد ہادی

اس بابرکت محفل میں مجھ سے پہلے بہت خوبصورت اور پرمغز باتیں ہوئیں، ایک سے ایک اچھی تجویز سامنے آئی۔ میں اس میں کوئی مزید اضافہ تو نہیں کر سکتا، صرف بزرگوں سے اخذ کئے ہوئے مطالعہ کا نچوڑ پیش کروں گا۔

میں سب سے پہلے منتظمین کا شکریہ ادا کروں گا کہ انہوں نے اس خوبصورت محفل کا بروقت انعقاد کر کے اہل فکر و دانش کو مل بیٹھ کر سوچنے کا موقع فراہم کیا۔ میں صرف اس عنوان کے انتخاب سے ابھرنے والے فکری سوالات پر کچھ عرض کرنے کی کوشش کروں گا۔ سیمینار کے لیے بڑے مناسب موضوع کا انتخاب کیا گیا ہے کہ 'معاشرے میں قیام امن کے لیے علماء کا کردار'۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ منتظمین نے اس سیمینار کے لیے یہ عنوان کیونکر منتخب نہیں کیا کہ 'قیام امن میں حکومت کی ذمہ داری' یا 'قیام امن میں سیاستدانوں کی ذمہ داری' یا 'قیام امن میں تاجروں کی ذمہ داری' یا 'قیامِ امن میں اہلِ صحافت کی ذمہ داری'۔ بہت سارے طبقات ہیں جو کسی نہ کسی طریقے سے قیام امن کے لیے اپنا کردار ادا کر سکتے ہیں۔ لیکن تمام طبقات کے بجائے صرف علمائے کرام اور ان کے کردار پر فوکس کیا گیا، یعنی کہ 'معاشرے میں قیامِ امن میں علماء کا کردار'۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ کیا سیمینار کے معزز منتظمین باوقار اور باعزت طریقے سے علماء کو اپنی ذمہ داری کی جانب متوجہ کرنا چاہتے ہیں۔ کیونکہ یقینی بات ہے کہ حاضرین محفل

میں کوئی شخص ایسا نہیں ہے جو قیامِ امن میں علماء کے کردار سے آگاہ نہ ہو، چنانچہ اس عنوان کے انتخاب کا مقصد یہ نہیں ہے کہ علماء کے کردار سے حاضرین کو آگاہ کیا جائے۔ ہوسکتا ہے کہ علماء کی حساس طبیعت کو مدِنظر رکھتے ہوئے انہوں نے بڑی احتیاط سے علماء کو متوجہ کرنے کے لیے اس عنوان کا انتخاب کیا ہو، بہرحال ہم حساس طبیعت کے مالک ہیں۔ اگر ہمیں کوئی یہ کہے کہ آپ میں خامی ہے اور آپ اپنا فرض نہیں ادا کررہے تو ہم جذباتی ہوجاتے ہیں۔ ایسے ماحول میں ہمیں احتیاط کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یا یہ کہ اس عنوان کے انتخاب کا مقصد یہ ہے کہ علماء یقیناً اپنی ذمہ داریوں سے آگاہ تو ہیں، لیکن علماء کے اندر اس طرح کی ایک تحریک پیدا کی جائے کہ وہ حساس اور ضروری مسائل کے حل کے لیے مشترکہ کوششوں کا آغاز کریں، چنانچہ اس کے لیے یہ پلیٹ فارم مہیا کیا گیا۔ بہرحال سیمینار کے لیے اس عنوان کو منتخب کرنے کا مقصد جو بھی ہو، نیک مقصد ہے۔ ہم اللہ تعالیٰ سے دعا گو ہیں کہ ہمیں اور منتظمین کو ان نیک مقاصد کی تکمیل کے لیے مل جل کر کام کرنے کی توفیق عطا کرے۔ اس حوالے سے مزید سوالات مجھ سے بہتر آپ کے ذہن میں آئے ہیں اور آتے رہیں گے لیکن جو سوالات اس عنوان کے انتخاب سے میرے ذہن میں آئے ہیں، وہ یہ ہیں؛

کیا قیامِ امن میں علماء کی کوئی ذمہ داری بھی ہے؟

کیا امن وامان کی تباہی میں علماء کا کوئی ہاتھ بھی ہے؟

کیا معاشرے کے مختلف طبقات کو علماء سے یہ توقع ہے کہ وہ قیامِ امن کے لیے بھرپور کردار ادا کریں؟

کیا علمائے کرام کو عوام کی ان توقعات کا احساس بھی ہے؟

کیا قیام امن کیلئے علماء میں صلاحیت بھی ہے؟

یہ وہ سوالات ہیں جو اس عنوان کے انتخاب سے ذہنوں میں ابھرتے ہیں۔ ایک سوال یہ بھی ہے کہ کیا ملک میں امن وامان کی ابتر صورتحال کے اسباب اور وجوہات، خواہ وہ سیاسی، معاشی، معاشرتی، طبقاتی یا مذہبی ہیں، ان تمام وجوہات اور اسباب کو ختم کرنے میں علماء کوئی کردار ادا کرسکتے؟ آپ مانیں یا نہ مانیں، اس ملک میں جو بھی امن وامان کی تباہی یا خرابی کی بات کرتا ہے، اس ضمن میں وہ اس امن وامان کی خرابی کی جانب اشارہ کرتا ہے جو مذہب اور مسلک کے اختلافی مسائل کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے، جبکہ سیاسی ومعاشی وجوہات کے باعث بھی بہت سے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ اب ایسی صورتحال میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس بدامنی پر قابو پانے کے لیے علماء نے کوئی مشترکہ، ہمہ گیر اور فعال کردار ادا کیا ہے اور کیا وہ اس قسم کا کردار ادا کرنے کے لیے تیار ہیں؟ میں اس سلسلہ میں اپنی گفتگو کو مختصر کرتے ہوئے چند تجاویز آپ کے سامنے پیش کروں گا۔

علمائے کرام کا معاشرے میں ایک مقام اور عزت ہے۔ علمائے کرام منبر ومحراب کے ذریعے عوام سے براہِ راست مخاطب ہوتے ہیں اور عوام دینی احکام جاننے کے لیے علمائے کرام کی جانب رجوع کرتے ہیں۔ اس لیے سیاست دانوں، تاجروں اور اہلِ صحافت کی نسبت علمائے کرام کے لیے زیادہ مواقع ہیں کہ وہ عوام کی رہنمائی کریں۔ خاص طور پر ایسے مسائل میں جو مذہب کے عنوان سے اس معاشرے میں موجود ہیں۔ اس صورت میں یقیناً علمائے کرام کو انبیاء کے وارث ہونے کے ناطے پیار ومحبت، امن وامان اور اخوت کا پیغام عام کرنا چاہیے۔ حدیثِ مبارکہ میں ارشاد ہوتا ہے کہ ''اذا صلح العالَم صلح العالَم واذا فسد العالَم فسد العالَم'' (ترجمہ؛ اگر علماء درست ہوں تو دنیا درست ہوسکتی ہے، اگر علماء میں کوئی خرابی ہو تو دنیا خراب ہوجاتی ہے)۔ اس حدیث میں علماء کے کردار کو مرکز ومحور قرار دیا گیا ہے، لہٰذا علمائے کرام کو امن وامان کی خرابی کا براہِ راست ذمہ دار تصور کیا جارہا ہے۔ علمائے کرام کو چاہیے کہ وہ امن وامان کے فروغ کے لیے منبر ومحراب کا استعمال کریں جو کہ اکثریت استعمال کررہی ہے، لیکن جیسا کہ ہر شعبے میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو اپنے گھناؤنے کردار سے اپنے شعبے کو بدنام کررہے ہیں تو چند لوگ یقیناً ہیں جو نادانی یا بدنیتی کی وجہ سے ایسا کردار ادا کررہے ہیں جن کی وجہ سے آج علماء کو ان سوالات کا سامنا ہے۔ سب سے پہلے علماء کو اپنے شعبے میں گھسی ہوئی کالی بھیڑوں کی نشاندہی

کرنا ہوگی۔اس کے لیے جرأت، ہم آہنگی اور متفقہ مؤقف اختیار کرنے کی ضرورت ہے۔امید ہے کہ ہم اس پلیٹ فارم اور سیمینار کے انعقاد سے فائدہ اٹھائیں گے اور اس پیغام کو صرف اس ہال تک محدود نہیں رکھیں گے، بلکہ معاشرے میں امن وامان کے لیے مل بیٹھ کر سوچیں گے، متفقہ مؤقف اختیار کریں گے اور علماء کے پاک دامن پر لگے ہوئے دھبے کو دھوئیں گے اور علماء کو وہ صحیح مقام دلائیں گے جو انہیں معاشرے میں ملنا چاہیے اور جو بدقسمتی سے کسی حد تک متاثر ہوا ہے۔

مولانا عمار خان ناصر

سب سے پہلے اس سوال کے حوالے سے گزارشات پیش کرنا چاہوں گا کہ علماء کے کردار کو اس سیمینار کا عنوان بنانے کے مضمرات کے جن بہت سے پہلوؤں کی طرف علامہ جواد ہادی نے اشارہ کیا ہے، میرے خیال میں اس کے اور بھی بہت سے پہلو ہیں۔اگر ہم اس کے مثبت پہلوؤں کی جانب توجہ کریں تو ایک تو یہ ہے کہ یہ ادارہ جو بنیادی طور پر مذہبی نہیں ہے، اس کی طرف سے ایسے عنوان کا انتخاب اور ملک بھر سے علمائے کرام کو دعوت دینا اور جمع کرنا اس لحاظ سے مثبت ہے کہ معاشرے کے مسائل میں مذہب اور علمائے کرام کی اہمیت کا اعتراف کیا جا رہا ہے۔بنیادی طور پر جس پسِ منظر سے اس ادارے کے لوگ متعلق ہیں، اس میں بھی بنیادی طور پر انتہا پسندی کی ایک شکل بہرحال موجود ہے، جس سے صحافت پر نظر رکھنے والے حضرات بخوبی واقف ہیں کہ ہمارے ہاں ایک خاص طبقہ سیکولرزم کی آخری انتہا کا حامی ہے۔وہ اس صورتحال کے مختلف پہلوؤں کو بنیاد بنا کر یہ نقطۂ نظر (صحیح یا غلط) پیش کر رہا ہے کہ معاشرے کے بگاڑ میں علمائے کرام کا کردار اتنا منفی ہے کہ اس طبقہ کو ایک کونے میں لگا دینا چاہیے اور معاشرے میں اس کے کردار کو محدود سے محدود کر دینا چاہیے، کیونکہ مذہبی طبقہ کے پاس معاشرے کو بہتر بنانے کے لیے کوئی لائحہ عمل نہیں ہے۔یہ معاشرے کو بگاڑنے میں تو اہم کردار ادا کرتا ہے، لیکن بہتر نہیں بنا سکتا۔چنانچہ اس پلیٹ فارم پر اس موضوع کے حوالے سے جو بھی مثبت یا منفی پہلوؤں سے بات ہوگی، اس کی رپورٹس جب عوام میں جائیں گی تو اس تاثر کو جو غیر حقیقی ہے، اس کے منفی اثرات کو زائل کرنے میں بہت مدد ملے گی۔دوسری چیز یہ ہے کہ ایسے ادارے کی طرف سے جو مذہبی افکار کا ترجمان نہیں ہے، اس کے بلانے پر علماء کا تشریف لے آنا اور ایک کھلے ماحول میں اپنے کردار پر گفتگو کرنا اس اَمر پر دلالت کرتا ہے کہ جیسا کہ عام طور پر تصور کیا جاتا ہے کہ علماء معاشرے میں خود کو بالاتر تصور کرتے ہیں اور علماء میں سے جو اہلِ فکر ونظر ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ معاشرہ ان کا محاسبہ کرنے یا ان سے جواب طلبی کرنے کا حق نہیں رکھتا۔علماء کا یہاں آنا اس بات کی دلالت کرتا ہے کہ معاشرے کے دیگر طبقات کی طرح علماء کا طبقہ بھی معاشرے کو جواب دہ ہے۔ایک پہلو یہ بھی سامنے آتا ہے کہ منتظمین کے ذہنی پسِ منظر میں اس عنوان کے انتخاب کے جو بھی اسباب ہوں، انہوں نے اسے محدود نہیں کیا کہ آپ اس کے کسی خاص پہلو پر گفتگو کریں۔عنوان عمومی ہے، لہٰذا زیادہ بہتر ہے کہ اس مسئلہ کے جو عمومی اور اصولی تناظر ہیں، اس میں اس کا جائزہ لیں۔دین اور نبی کریم ﷺ کی سیرت کی رو سے علماء کا جو کردار بنتا ہے، اس کو ادا کرنے میں ہماری طرف سے جو کوتاہیاں اور خامیاں ہیں، ان پر غور کریں۔نبی کریم ﷺ کی سیرت طیبہ کے مطالعہ سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اللہ کے دین کی دعوت وتبلیغ، لوگوں کے اخلاق وکردار کو بہتر بنانا، معاشرے میں امن کا قیام اور وہ عناصر جن کے درمیان روایتی پسِ منظر میں تصادم کی صورتیں موجود تھیں یا جہاں جہاں معاشرے میں تصادم اور خون ریزی کا خطرہ موجود تھا، تو یہ بھی حضور ﷺ کا موضوع تھا۔خاص طور پر مدینہ طیبہ میں اس کے تین اہم پہلو سامنے آتے ہیں۔سب سے پہلے تو یہ کہ نبی کریم ﷺ نے خود اپنی ذاتِ گرامی کو اس حوالے سے بہترین نمونے کے طور پر پیش کیا کہ آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی سے ایسی کوئی بات صادر نہ ہو جس سے کسی کو تکلیف ہو، دکھ ہو یا اس سے ایسا اشتعال پیدا ہو جو معاشرے کا امن خراب کرنے کا سبب بنے۔رسول ﷺ نے کسی کو کبھی دکھ یا تکلیف نہیں پہنچائی، نہ زبان سے اور نہ ہی ہاتھ

سے۔جن لوگوں نے حضورﷺ کو اذیت پہنچائی تو آپ نے کسی سے انتقام نہیں لیا۔حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کہ آپ نے کبھی اپنی ذات کیلئے کسی سے انتقام نہیں لیا اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ایک مرتبہ جب مدینہ طیبہ میں آپﷺ کو ایک ریاست کے حاکم کی حیثیت حاصل ہوئی تو آپﷺ نے بہت سے مواقع پر جب منافقین یہود و نصاریٰ نے آپ کی ذات کو طعن و تشنیع اور توہین کا نشانہ بنایا تو آپﷺ نے اس طرح کے واقعات سے صرفِ نظر کیا اور مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کیا تا کہ بات آگے بڑھ کر تصادم کی شکل اختیار نہ کرے۔اس طرح کے واقعات سیرتِ طیبہﷺ میں معروف ہیں۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ سیرتﷺ سے ظاہر ہوتا ہے کہ علماء منصب نبوت کے وارث ہیں، اگرچہ انہیں نبوت منتقل نہیں ہوئی لیکن نبوت کے منصب کی جو شان ہے، یعنی اس کے جو روحانی اور دعوتی پہلو ہیں، وہ یقیناً منتقل ہوئے ہیں، علمائے کرام بھی اپنے شخصی کردار سے اس کا نمونہ پیش کریں ،تا کہ ان کی ذات معاشرے اور ماحول میں امن کا پیغام پھیلانے کا ذریعہ بنے۔ان سے کوئی ایسی بات صادر نہ ہو جس سے معاشرے میں امن خراب ہو۔دوسری چیز جو سیرتﷺ میں نمایاں نظر آتی ہے کہ رسولﷺ کے عہد میں جو بھی تنازعات اور مسائل موجود تھے، آپﷺ نے انہیں حل کرنے کی کوشش کو اپنا مقصد بنایا۔روایات میں بیان ہوتا ہے کہ رسولﷺ مدینہ طیبہ کے اردگرد جو مختلف قبائل تھے، وہاں پر کثرت سے تشریف لے جاتے تھے۔آپﷺ کے ان قبائل میں جانے کا سبب یہ بیان کیا جاتا ہے کہ آپﷺ قبائل میں مختلف خاندانوں کے آپس کے تنازعات کا تصفیہ کرواتے تھے اور خود فتح مکہ کے موقع پر اپﷺ نے اس حال میں کہ آپﷺ کے پاس قانونی اختیار بھی تھا اور آپﷺ اللہ کے پیغمبر بھی تھے، اس موقع پر آپﷺ نے جو غیر معمولی اعلانات اور فیصلے کئے، ان میں سے ایک تاریخی نوعیت کا فیصلہ یہ بھی تھا کہ آپﷺ نے عرب قبائل میں چلے آرہے تنازعات کا خاتمہ کیا اور یہ فیصلہ کیا کہ آج کے بعد ماضی کے قصاص کے کسی مقدمے کو زیرِ بحث نہیں لایا جائے گا۔

دوسری چیز یہ ہے کہ آپﷺ نے تنازعات کے حل کے لیے بہت زیادہ سعی کی اور ایک اہم چیز کہ معاشرے کے جن عناصر کے مابین مختلف جگہوں پر تصادم کا امکان موجود تھا، تو حضورﷺ نے اس پر بھی پوری نظر رکھی اور اس بات کا اہتمام کیا کہ اپنے تشریف لے جانے سے پہلے لوگوں کو ان جگہوں کے حوالے سے آگاہ کر دیں، کہ میرے جانے کے بعد یہاں یہ صورتحال پیدا ہوگی اور اس میں تم نے یہ رویہ اختیار کرنا ہے۔حدیث میں تین بڑی معروف مثالیں ہیں۔پہلی یہ کہ آپﷺ کو احساس تھا کہ میرے بعد حکمرانی کے حوالے سے انصار اور مہاجرین میں کشمکش کا ماحول پیدا ہوسکتا ہے تو رسولﷺ نے اپنی زندگی میں اس کو موضوع بنایا اور انصار کی ذہن سازی کی اور انہیں اس بات پر آمادہ کیا کہ تمہاری بڑی قربانیاں اور خدمات ہیں، لیکن پورے عرب پر حکومت کرنے کیلئے قریش ہی زیادہ موزوں ہیں، چنانچہ تمہیں نظر انداز کیا جائے گا اور تم پر دوسرے لوگوں کو ترجیح دی جائے گی۔تم نے اس کے لیے اللہ کو نہیں چھوڑ دینا، تمہیں اس کا اجر آخرت میں ملے گا، پھر آپﷺ نے حکمرانوں کی طرف سے ظلم و زیادتی اور اس کے ردِ عمل میں لوگوں میں جو اشتعال پیدا ہوسکتا ہے، اس پر بھی روشنی ڈالی اور لوگوں کو بتایا کہ میرے بعد لازماً ایسے حکمران آئیں گے جو ظلم و ستم روا رکھیں گے اور ناانصافی کریں گے۔آپﷺ نے عوام کو بہت واضح ہدایات دیں کہ جب تک حکمران کفر بواح کے درجے پر جا کر کسی حرکت کا ارتکاب نہ کریں تو تمہیں ان کا ظلم برداشت کرنا ہے اور ان کے خلاف کسی قسم کی جارحیت نہیں کرنی اور تم نے ہر حال میں حق گوئی کرنی ہے۔ایک تیسری چیز یہ کہ عرب قبائل میں جو کشمکش چلی آرہی تھی، آپﷺ نے حجت الوداع کے موقع پر اس کو بھی عنوان بنایا اور فرمایا: ''یہ نہ ہو کہ میرے بعد تم دوبارہ اس کفر کی حالت میں چلے جاؤ جس میں لوگ ایک دوسرے کی گردنیں کاٹتے ہیں۔'' یہ تین پہلو حضورﷺ کی سیرت سے سامنے آتے ہیں۔علماء کا بھی یہ معیاری کردار بنتا ہے کہ معاشرے میں امن و امان کی بات کی جائے تو یہ مطلوب بھی ہے اور ان سے اس کی بجا طور پر توقع بھی کی جانی چاہیے کہ وہ ان تین پہلوؤں سے اپنے معاشرے کے مسائل کے حل کے لیے بھرپور اور فعال کردار ادا کریں۔اس موضوع پر الگ بحث ہونی چاہیے، تا کہ ہمارے معاشرے میں طبقہ علماء معروضی حالات میں اپنا کردار ادا کیوں نہیں کرتا اور وہ کیا وجوہ ہیں کہ جن کی وجہ سے علماء کا طبقہ ایسے چند افراد، جن کی وجہ سے فرقہ واریت پھیل رہی ہے، ان سے برأت کا اظہار کیوں نہیں کر رہا؟ یہ درست ہے کہ سارے لوگ

ایسے نہیں، لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ چند لوگ یہ کام کرتے ہیں، ان سے خود کو الگ کرنے کی ذمہ داری علماء پر عائد ہوتی ہے جو وہ پوری نہیں کر رہے۔ اور ایک سطح ایسی بھی آتی ہے کہ اس طبقے کی نمائندگی کا شرف ہی اس محدود طبقے کو حاصل ہو جاتا ہے، جبکہ دوسرے سنجیدہ، باکردار اور مہذب لوگوں کو نمائندہ ہی نہیں سمجھا جاتا۔ مجھے میرے والد نے ایک واقعہ سنایا کہ بچپن میں ان کے ہاں ایک جلسہ تھا تو والد صاحب جن کی عمر اس وقت دس گیارہ سال تھی، حوصلہ افزائی کیلئے ان کو بھی تقریر کرنے کا موقع دیا گیا۔ ہمارے دادا مولانا سرفراز صفدر بھی دوسرے علماء کے ہمراہ وہاں تشریف فرما تھے۔ والدِ گرامی بتاتے ہیں کہ میں نے قادیانیت کے موضوع پر تقریر کی تو غیرت ایمانی میں آکر مرزا غلام احمد قادیانی کو گالی دے دی۔ وہ بتاتے ہیں کہ والد صاحب فوراً پیچھے سے اٹھ کر آئے اور انہوں نے مجھے گردن سے پکڑ کر پیچھے کیا اور میری جگہ پر کھڑے ہو گئے اور باقاعدہ معذرت کی اور کہا کہ یہ بچہ ہے اور ناسمجھ ہے۔ اس نے غلط بات کہہ دی ہے۔ اسے گالی نہیں دینی چاہیے تھی۔

میرے خیال میں جب تک یہ کردار ہر طبقہ کے علماء ادا نہیں کرتے، اس وقت تک یہ ذمہ داری درست طور پر ادا نہیں ہو سکتی۔ جب تک ہم دیانت داری اور خلوصِ نیت کے ساتھ اس حوالے سے اقدامات نہیں کریں گے تو اس وقت تک ہم خود کو بری الذمہ قرار نہیں دے سکتے۔

صدارتی خطبہ؛ ڈاکٹر خالد مسعود

میں اس قرآنی آیت کو آپ کے سامنے پیش کروں گا، ترجمہ؛ ''بے شک اللہ تعالیٰ نہیں بدلتا کسی قوم کو، جب تک وہ خود اپنے آپ کو نہ بدلے۔'' اس آیت سے میرے ذہن میں یہ بات آئی ہے کہ قوم میں تبدیلی بھی افراد سے آتی ہے اور خرابیاں بھی افراد سے ہی پیدا ہوتی ہیں اور تیسرا یہ کہ خود احتسابی بھی ضروری ہے۔ میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ علمائے کرام کا کردار محض رہنما کا ہی نہیں، بلکہ دینی زندگی کی عملی مثال کے طور پر بھی ان کا کردار ہے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ وہ اسلامی معاشرے کا ضمیر بھی ہیں، چنانچہ یہ علماء کی ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ اسلام کے بارے میں نہ صرف پاکستان میں بلکہ پوری دنیا میں جو غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں، ان کا نہ صرف جواب دیں، بلکہ اس پر بھی غور کریں کہ صورتحال کو اس نہج تک پہنچانے میں مذہبی طبقہ بلاواسطہ یا بلواسطہ کس حد تک ذمہ دار ہے۔ اگر ذمہ دار ہے تو اس کا حل کیا ہے؟ میں یہ جسارت اس لیے بھی کر رہا ہوں کہ خوش قسمتی سے پاکستان بھر کے تمام علماء یہاں موجود ہیں اور علماء پر جو سوالات اٹھائے جا رہے ہیں، ان پر بہت گفتگو ہوئی کہ اس صورتحال کے صرف علماء ذمہ دار نہیں ہیں۔ اس پر مزید گفتگو کی ضرورت نہیں لیکن علماء بہرحال بالواسطہ یا بلاواسطہ اس صورتحال کے ذمہ دار ہیں۔ اس سلسلے میں خاص طور پر دو اقدامات کرنے کی ضرورت ہے، ایک تو یہ کہ ہماری سیاسی، سماجی، معاشی فکر میں کچھ ابہامات موجود ہیں، جنہیں دور نہ کیا گیا تو صورت حال خاصی حد تک اسی طرح رہے گی، یہ ابہامات تحریکِ پاکستان سے شروع ہوئے اور اب تک موجود ہیں۔ دوسرا، ہمیں یہ بھی دیکھنا ہے کہ اس وقت کچھ ایسی چیزیں ہیں جن پر توجہ نہ دی گئی تو بلواسطہ طور پر اس سے معاشرہ غلط رخ اختیار کر سکتا ہے۔ سب سے پہلا مسئلہ قانون اور اس کی حکمرانی سے متعلق ہے۔ بہت ہی جسارت سے عرض کر رہا ہوں کہ مذہبی طبقہ کی طرف سے سوالات پیدا کئے گئے جن کی وجہ سے لوگوں میں ابہام اور مشکل پیدا ہوئی۔ علماء کا یہ کہنا ہے کہ وہ قانون جو حکومت بناتی ہے، مذہبی حوالے سے اس قانون پر عمل کرنا ضروری نہیں ہے۔ کچھ قوانین واجب الاطاعت ہیں اور کچھ نہیں، علماء کی جانب سے قانون کی اس تفریق سے لوگوں کے ذہنوں میں خلجان اور ابہام پیدا ہوتا ہے اور جب تک ہم اس مسئلے کا واضح حل پیش نہیں کریں گے تو یہ مسئلہ اسی طرح برقرار رہے گا۔ میرا خیال ہے کہ یہ اشارہ کافی ہے۔ دوسری چیز جو مذہبی طبقے سے منسوب کی جاتی ہے، وہ مذہبی طبقے کی جانب سے قانون کو ہاتھ میں لینے کی حوصلہ افزائی کرنا ہے جس کے لیے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے نام بھی لئے جاتے ہیں۔ بہرحال یہ ایک الگ بحث ہے، لیکن اگر کوئی خرابی ہے اور کوئی کام دین، شریعت یا فقہ کے خلاف ہو رہا ہے تو اس پر از خود سزا دینا اور بغیر قانونی کارروائی کے ایکشن

لینا کس حد تک درست ہے، اس حوالے سے مذہبی طبقے کو عوام کو حقائق سے آگاہ کرنا ہوگا۔ تیسری چیز ملک میں معروف عدالتی نظام ہے، اس کے علاوہ جرگے، پنچایت اور دیگر سماجی ڈھانچوں میں فتویٰ نویسی بھی ایک عدالتی ڈھانچے کو ظاہر کرتی ہے، کیونکہ اس میں لوگ مختلف علمائے کرام اور مفتیان عظام سے رہنمائی چاہتے ہیں تو اس فتویٰ کی حیثیت بھی ایک فیصلے کی بن جاتی ہے جس کی وجہ سے بہت سارے ابہام پیدا ہوتے ہیں۔ دوسرا پہلو، جس پر سماجی حوالے سے بہت بات ہوئی۔ وہ ہمارے معاشرے میں پنپنے والے عدم برداشت کے رویے ہیں، جس پر بہت سے علماء نے بات کی۔ میں کھل کر یہ بات کرنا چاہتا ہوں کے مدرسے تو کسی مجبوری کی بناء پر کسی ایک مسلک سے منسلک تھے لیکن مساجد بھی مختلف مسالک سے منسلک ہوئیں اور اس کی وجہ سے معاشرے میں دین و مذہب کے نام پر عدم برداشت کے رویے فروغ پائے، یہ بھی قابلِ غور ہے۔

سب سے بڑا مسئلہ معاشی ہے۔ معاشی مسائل میں جو عام رجحان ہے، وہ حکومت کی طرف سے عائد کردہ ٹیکس اور جو دینی ادائیگی ہے، مثال کے طور پر زکوۃ، ان میں فرق ہے کہ اگر ایک آدمی زکوٰۃ ادا کرتا ہے تو اس کو ٹیکس نہیں دینا۔ میں یہ نہیں کہتا کہ علماء نے اس بارے میں فتویٰ جاری کیا ہے لیکن عوام میں اس بارے میں ابہام پایا جاتا ہے۔ اسی طرح رشوت کے بارے میں بھی ابہام ہے، مثال کے طور پر مختلف فتاویٰ میں ہے کہ اگر مجبوری میں کوئی جائز کام نکل نہ رہا ہو تو اس میں رشوت دینا جائز ہے، تو اس سے بھی ایک طرح سے ابہام پیدا ہوتا ہے۔ جس وقت ہم جاگیرداروں اور زمین داروں کی بات کرتے ہیں تو علماء کا قیامِ پاکستان سے پہلے عمومی رجحان یہ تھا کہ حکومت اگر معاشرے کی ضرورتوں کے لیے زرعی اصلاحات نافذ کرنا چاہے تو اس کی اجازت ہے لیکن جب پاکستان میں زرعی اصلاحات کی گئیں تو پھر شخصی ملکیت پر بھی ہمارے ہاں اختلافات پیدا ہوئے اور اس پر لوگوں نے کتابیں لکھ ڈالیں اور بعض مواقع پر عدالتوں میں رجوع کر کے حکومت کو کہا گیا کہ یہ حکومت کے اختیار میں نہیں کہ وہ یہ ملکیت اپنے اختیار میں لے تو کبھی ہم شخصی ملکیت کو اس قدر فوقیت دیتے ہیں، جبکہ دوسری طرف ہم وڈیروں، زمین داروں اور جاگیرداروں کے نظام کے خلاف بھی بات کرتے ہیں۔

تعلیمی مسائل پر بھی بہت گفتگو ہوئی۔ اختلاف رائے ہماری روایات کا قابل فخر حصہ ہے۔ اختلاف رائے سے ہی بات آگے بڑھتی ہے اور ہمارے ہاں علماء کے اختلاف کو ہمیشہ اہمیت دی گئی ہے۔ ہمارے مدارس میں پہلے تمام علماء اور مذاہب کے کلامی اور فقہی اختلافات کو دلائل کے ساتھ پڑھایا جاتا تھا اور اس کے بعد اپنے مسلک کی بات کی جاتی تھی لیکن شاید اب نصاب کو مختصر کرتے ہوئے دلائل کا حصہ کم کر دیا گیا ہے، جس کی وجہ سے مسلکی اختلافات بڑھ گئے ہیں اور بعض اوقات ہم تعصب کی حد تک اپنے مسلک کے قائل ہو جاتے ہیں، جس کی وجہ سے طلباء میں تحقیق کرنے اور آگے بڑھنے کا رجحان نہ ہونے کے برابر ہے۔ یہ سب باتیں جو میں نے کی ہیں، ان میں کچھ میرے اپنے مشاہدات اور اندازے ہیں، جبکہ علماء پر لکھی جانے والی کتابوں میں ان میں سے بھی بہت کچھ اخذ کیا گیا ہے۔ ان میں سے بہت سارے عوامل ایسے ہیں جن کی وجہ سے معاشرے میں بدامنی پیدا ہوتی ہے۔

وقفۂ سوالات

سوال: میرا سوال ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے ہے کہ آپ اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئرمین رہے اور اس وقت ملک کے اندر جو بہت بڑا فساد بپا ہے، اس کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات دستور کے مطابق قومی و صوبائی اسمبلی اور سینٹ میں پیش کرنا اور دو سال کے اندر ان پر قانون سازی ضروری ہے۔ انتظامیہ، حکومت، عدلیہ اور اسلامی نظریاتی کونسل نے اگر اپنا فرض ادا کیا ہوتا تو آج اس معاشرے میں علماء زیادہ مضبوط ہوتے۔ وہ نوجوان جن کی تعلیم کم ہے اور جنہیں گمراہ کیا گیا ہے، وہ علمائے کرام کے کنٹرول میں ہوتے۔ میں نے اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات آج سے دس سال پہلے پڑھیں اور حسبہ بل کے حوالے سے اس پر کام کیا، جس پر تمام مکاتبِ فکر کے علماء متفق تھے۔ ہم نے شریعت

کے نفاذ پر اتفاق کیا، جس کی وجہ سے صوبہ پختونخوا میں شرعی قانون نافذ ہوا۔ علمائے کرام کے خلاف تو باقاعدہ پروپیگنڈہ کیا گیا ہے۔ میں پوچھنا چاہتا ہوں کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی سفارشات آپ نے اپنے دور میں لازمی طور پر پیش کی ہوں گی، اگر حکومت اور پارلیمنٹ نے اس پر عمل نہیں کیا تو اس پر آپ نے کیا احتجاج کیا اور حکومت نے کیا جواب دیا؟

جواب: (ڈاکٹر خالد مسعود) اس وقت اسلامی نظریاتی کونسل زیر بحث نہیں، لیکن چونکہ آپ کا سوال اسلامی نظریاتی کونسل سے متعلق ہے، اس لیے مختصر جواب دوں گا۔ اسلامی نظریاتی کونسل نے 80 سے زیادہ سفارشات پیش کی ہیں، لیکن اس میں سے ایک پر بھی نہ سینٹ، نہ اسمبلی اور نہ پارلیمنٹ میں کبھی کوئی بحث ہوئی۔ اس ایک وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظریاتی کونسل کی حیثیت ایک مشاورتی ادارے کی ہے۔ دوسرا یہ کہ اگرچہ آئین میں واضح ہے کہ رپورٹ کو پیش کرنے کے بعد اسے چھ ماہ میں زیر بحث لایا جائے اور دو سال میں اس پر قانون سازی ہو لیکن آج تک کبھی پہلا مرحلہ بھی مکمل نہیں ہوا۔ اب اگر آپ میری کوششوں کا ذکر فرما رہے ہیں تو ہم نے ہر لحاظ سے کوشش کی، ہم ہر وزیر اعظم کے پاس گئے اور آخر میں میں نے یہ بھی کیا کہ صرف سفارشات کا خلاصہ یا صرف وہ قوانین جن پر کونسل نے غور کیا جو تقریباً سات، آٹھ سو صفحات کی کتاب بنتی ہے، اسے لے کر سینٹ کے چیئرمین فاروق ایچ نائیک اور وزیرِ قانون بابر اعوان کے پاس گیا اور ان سے کہا کہ اس کتاب کے دو حصے ہیں، ایک تو یہ کہ اسلامی نظریاتی کونسل نے 1726ء سے 2007ء تک جتنے بھی قوانین نافذ رہے، ان پر غور کیا، ان میں کچھ قوانین ایسے بھی تھے جو قرآن وسنت کے متصادم نہیں تھا۔ اس پر اسلامی نظریاتی کونسل نے رائے دے دی کہ اگر آپ اپنی پہلی کوشش یہ کریں کہ ان کو پارلیمنٹ میں لے جائیں، کیوں کہ اس وقت قومی اسمبلی اور سینٹ میں علمائے کرام کی پہلے سے زیادہ نمائندگی ہے تو آسانی سے یہ مرحلہ مکمل ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد کمیٹیاں بھی بنیں، لیکن وہ مرحلہ نہیں آیا۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ اس وقت اس کے لیے سیاسی کوششوں کی ضرورت ہے جو کہ پہلے کبھی نہیں ہوئیں۔ مجھے امید ہے کہ مولانا شیرانی صاحب کی قیادت میں، کیونکہ ان کا تعلق بڑی سیاسی جماعت سے ہے، اس لیے اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ اب اس پر زیادہ تیزی سے کام ہوگا۔ اصل میں اس حوالے سے قانونی رکاوٹیں بڑا مسئلہ ہیں، کیونکہ یہ سفارشات پہلے وزارتِ مذہبی امور کو پیش کی جاتی ہیں اور وزارت مذہبی امور انہیں آگے پیش کرتی ہے۔ وزارت مذہبی امور سے کہا جاتا ہے کہ وہ ان سفارشات کی توثیق کرے۔ علماء کی ایک مجلس نے جن سفارشات پر غور کیا ہوتا ہے، وزارتِ مذہبی امور کا ایک کلرک اس پر نوٹ لکھتا ہے اور اس نوٹ پر آگے جا کر غور ہوتا ہے، یہ ایک پورا بیوروکریٹک نظام ہے، جس کے باعث سفارشات کی اہمیت ختم ہو جاتی ہے۔

سوال: آپ نے یہ کہا کہ قانون کی حکمرانی پر علماء بات نہیں کرتے اور آپ یہ بھی فرماتے ہیں کہ جو قانون پہلے سے بنا ہوا ہے، اس پر عمل نہ کیا گیا تو معاشرے میں بدعنوانیاں پیدا ہوں گی، لیکن جب قانون میں اللہ اور قرآن وسنت کی نافرمانی ہو تو کیا علماء اس پر خاموش بیٹھے رہیں گے اور یہ کہیں گے کہ عہدِ حاضر کے حکمرانوں کے بنائے ہوئے قانون پر عمل کرنا چاہیے تاکہ معاشرے میں بگاڑ پیدا نہ ہو؟ دوسرا سوال یہ ہے کہ موجودہ حالات میں بدامنی کی جو لہر معاشرے میں پھیلی ہے، کیا یہ علماء کے کردار کی وجہ سے ہے یا یہ ایک بین الاقوامی سازش ہے، جو کہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت ہم پر مسلط کی گئی ہے۔ اگر آپ سمجھتے ہیں کہ یہ بین الاقوامی سازش ہے تو اس کے حل میں علماء کیا کردار ادا کر سکتے ہیں؟

جواب: (ڈاکٹر خالد مسعود) آپ نے بالکل بجا کہا کہ جن قوانین میں اللہ کے حکم کی مخالفت ہو، وہ واجب الاطاعت نہیں رہتا، لیکن اس کیلئے علماء وفقہاء نے ایک لائحہ عمل بھی دیا ہے، یہ نہیں کہ اگر کوئی بھی شخص یہ سمجھتا ہے کہ یہ قانون اللہ کے قانون کے خلاف ہے تو میں اس کے خلاف کھڑا ہو جاؤں اور جو بھی اس کی خلاف ورزی کرے، میں اس کی مار پیٹ کرنا شروع کر دوں۔ علماء کبھی اس حد تک نہیں گئے۔ کسی عالم اور فقیہہ نے کبھی قانون کو ہاتھ میں لینے کا مشورہ نہیں دیا، خواہ وہ کتنا ہی قرآن وسنت سے متصادم کیوں نہ ہو۔ اس کا ایک طریقۂ کار مقرر ہے، کیونکہ اگر یہ حق ہر شخص کو دے دیا جائے تو بہت سارے مسائل پیدا ہوتے ہیں۔ جب علمائے کرام کسی فقہی مسئلے پر مشاورت کرتے ہیں، جب وہ مسئلہ کسی عمل سے گزرے گا

تو اس کا کوئی نتیجہ برآمد ہوگا اور جب ایک شخص انفرادی طور پر اس مسئلے کے بارے میں رائے یا فیصلہ دے گا تو بالکل فرق ہوگا۔ علمائے کرام کو مختصر بات نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ پھر اس سے دوسرے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں۔ علمائے کرام کو یہ بھی بتانا چاہیے کہ شریعت اور فقہ نے ایک لائحہ عمل دیا ہے جس سے رہنمائی حاصل کرنا ضروری ہے۔

جہاں تک بین الاقوامی سازش سے متعلق پوچھے گئے سوال کا تعلق ہے تو میں صرف اتنا کہوں گا کہ جب آپ لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ بین الاقوامی سازش ہے تو اس وقت سیاسی اور خاص طور پر دہشت گرد تنظیمیں اس صورتحال سے فائدہ اٹھاتی ہیں اور بہتر یہ ہے کہ انہیں ایسا کوئی موقع فراہم نہ کیا جائے۔

سوال: (مفتی رفیق احمد) مولانا عمار صاحب نے فرمایا کہ علماء کا معاشرے کے سامنے جوابدہ ہونا ضروری ہے، جس طرح دوسرے لوگ جوابدہ ہیں تو علماء کو بھی جوابدہ ہونا چاہیے۔ یہ بات فی الجملہ اپنی جگہ ٹھیک ہے، لیکن اس وقت جو فکر چل رہی ہے کہ علماء عوام کی عدالت میں پیش ہوں تو اس سے فکری اور عملی طور پر بے چینی، اضطراب اور تشویش کی کیفیت پیدا ہوتی ہے۔ اس کیفیت میں جو رعیت اور مسئولیت کا امتیاز ہے، وہ بھی مٹ جاتا ہے، چنانچہ جب ہم یہ گفتگو کرتے ہیں کہ علماء جوابدہ ہیں تو وہاں مسئولیت اور رعیت کا امتیاز بھی ہمارے سامنے ہونا چاہیے، اگر ایسا ممکن ہو تو اس سے علماء کے درمیان پائی جانے والی تشویش کا ازالہ ممکن ہو سکے گا۔ جواب دہی کے لیے اگر عوام کو جج بنا دیں اور علماء کو کٹہرے میں کھڑا کر دیں تو عوام اور علماء کے درمیان بداعتمادی کی فضاء پیدا ہوگی جس کے باعث پُرامن اور متوازن معاشرے میں مزید خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔

جواب: (ڈاکٹر خالد مسعود) علامہ اُبو اسحاق شاطبیؒ ایک جگہ ذکر فرماتے ہیں کہ جب فتویٰ دیا جاتا ہے تو اس کے بعد لوگ یا عوام مفتی سے یہ نہیں پوچھتے کہ اس کے ذرائع اور مصادر کیا ہیں؟ اس سے بہت زیادہ خرابیاں پیدا ہوتی ہیں اور ہماری فوج بھی تو یہی کہتی ہے کہ وہ کسی کے سامنے جواب دہ نہیں ہے۔

رائے: (مفتی محمد زاہد) ڈاکٹر صاحب نے فرمایا ہے کہ دوسرے مسالک کے مؤقف کا ذکر تو کیا جاتا ہے لیکن ان کے دلائل پیش نہیں کئے جاتے۔ جہاں تک سنی مدارس ہیں، مثال کے طور پر بریلوی، اہل حدیث، اور دیوبندی وغیرہ، ان میں دوسرے مکاتبِ فکر کی رائے کا ذکر ہوتا ہوگا اور دلائل بھی ہوں گا، مثال کے طور پر آپ 'ہدایہ' دیکھ لیں، جس میں آئمہ اُربعہ کے مؤقف دلائل کے ساتھ موجود ہیں۔ ہمارے ہاں جو مسئلہ پیدا ہو رہا ہے، وہ یہ کہ پاکستان کے تناظر میں جو مسالک ہیں، ان میں دوسرے کے مسلک کا درست تعارف نہیں کروایا جاتا۔ مثال کے طور میں ایک دیوبندی ہوں تو ایک بریلوی یا شیعہ کا میرے بارے میں تصور ہے کہ میرا یہ عقیدہ ہوگا۔ ہوسکتا ہے حقیقت میں ایسا نہ ہو۔ ایک بریلوی کے بارے میں مَیں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اللہ کے علاوہ کسی اور کو بھی خدا مانتے ہیں۔ میرا تصور یہ ہے اور میں اپنے طالب علموں کو بھی ان کے بارے میں یہی بتاتا ہوں، لیکن حقیقت میں ان کا نقطہ نظر یہ نہ ہو۔ اہل تشیع ہوسکتا ہے ہمارے بارے میں یہ بتاتے ہوں کہ ان کی اہل بیتؓ کے ساتھ وہ عقیدت نہیں جو ہونی چاہیے اور ہوسکتا ہے کہ ہم اپنے لوگوں کو اہل تشیع کے بارے میں یہ بتاتے ہوں کہ وہ قرآن کو نہیں مانتے یا فلاں فرائض پر عمل نہیں کرتے، لیکن ہوسکتا ہے یہ تاثر حقیقت کے خلاف ہو اور ان کے ہاں بھی یہ چیزیں نہ ہوں جس طرح ہم اپنے لوگوں کو ان سے متعارف کروا رہے ہوتے ہیں۔ مشترکہ نصاب کی بات ہو رہی تھی، اس کی تشکیل بہت زیادہ مشکل ہے، لیکن کوئی ایسا کتابچہ جس میں تمام مکاتب فکر کے بنیادی نظریات خود ان کی تعلیمات کی روشنی میں بیان کیے گئے ہوں، ہونا چاہیے اور وہ شاملِ نصاب کیا جاسکتا ہے، کیونکہ کسی بھی مکتبۂ فکر کو اپنا عقیدہ بیان کرنے کا اختیار حاصل ہے اور وہ خود بتائیں کہ ان کا عقیدہ کیا ہے۔ مجھے یہ اختیار نہیں کہ میں ان کے بارے میں بتاؤں کہ ان کا عقیدہ کیا ہے۔ اس سلسلے میں اتحاد تنظیمات المدارس کوئی ایسا قدم اٹھائے کہ ایسا کوئی مشترکہ مواد تیار ہو جائے جس میں تمام مکاتب فکر کی بنیادی چیزیں ہوں اور وہ بنیادی مسائل بھی زیرِ بحث آجائیں، جن پر ان مسالک کا اختلاف ہے، تاکہ ایک دوسرے کے بارے میں پیدا ہونے والی غلط فہمیوں کا خاتمہ کیا جاسکے۔ ایک

دوسرے کے مکتبۂ فکر کا تعارف اگر درست طور پر معلوم ہو جائے، اگرچہ دلائل نہ بھی ہوں تو مسئلہ کافی حد تک حل ہو جائے گا۔

جواب: (ڈاکٹر خالد مسعود) میرا خیال ہے کہ اس تجویز پر کسی کو اختلاف نہیں ہے۔

رائے: امر بالمعروف ونہی عن المنکر وارث الانبیاء کا کام تھا۔ امر بالمعروف کا کام ہر تنظیم اچھے طریقے سے کر رہی ہے، لیکن نہی عن المنکر کے لیے علماء کی جانب سے کوئی ٹھوس اقدام سامنے نہیں آیا اور آج ہم حکمرانوں سے اپنی بے بسی کا ذکر کر رہے ہیں۔ امامت صغریٰ اور امامت کبریٰ میں سے آج ہم امامت صغریٰ پر تو راضی ہو گئے ہیں، لیکن امامت کبریٰ پر راضی نہیں ہیں، جبکہ اس کی جانب کوئی توجہ نہیں۔ ایک دوسرا نقطہ نظامِ عقل اور نظامِ وحی کا ہے۔ یہ علماء کا کام تھا کہ وہ نظامِ وحی کے نفاذ کے لیے پوری طرح میدانِ عمل میں ہوتے تو نظامِ عقل والے سروں پر مسلط نہ ہوتے۔ میری یہ ایک تجویز ہے کہ قرآن وحدیث میں جو علماء کا کردار متعین ہے تو اس حوالے سے ہمیں منکر اور طاغوت کے تدارک لئے اور نظام وحی کے نفاذ کیلئے ٹھوس اقدامات کرنا ہوں گے۔

سوال: (علامہ سید فرحت حسین شاہ) میرا سوال مولانا یٰسین ظفر صاحب اور مولانا عمار ناصر صاحب سے ہے کہ آپ نے عقیدۂ توحید پر زور دیا، کیا آپ ان امور کی وضاحت کریں گے، جن سے عقیدۂ توحید کو خطرات لاحق ہیں، تاکہ تمام علماء ان کی طرف توجہ دیں اور عامۃ الناس کی بھی رہنمائی ہو اور دوسری بات یہ کہی گئی کہ شرک سے بچنا ہوگا۔ شرک کے حوالے سے بہت سے سوالات ذہن میں ابھرتے ہیں کہ جب ایسا کوئی فتویٰ کسی پر لگ جاتا ہے تو اسی وجہ سے بدامنی اور انتشار پھیلتا ہے اور ایک دوسرے کو قتل کرنا بھی جائز تصور کیا جاتا ہے۔ وہ کون سے عوامل ہیں جن کے بارے میں آپ سمجھتے ہیں کہ یہ شرک ہیں اور جن کی وجہ سے شرک کا فتویٰ جاری ہوتا ہے؟ اور ان امور سے ہم کیسے بچ سکتے ہیں؟ مولانا ابوالحسن صاحب نے بڑی خوبصورت بات کی کہ ہمیں اپنا طریقۂ تدریس اور تقریر تبدیل کرنا ہوگا۔ میں شاہ صاحب سے بھی گزارش کروں گا آپ بھی تھوڑی سی وضاحت فرمائیے کہ وہ کون سے طریقۂ ہائے تدریس ہیں، جنہیں استعمال کر کے ہم معاشرے میں تبدیلی لا سکتے ہیں؟ اور آخری سوال ڈاکٹر خالد مسعود صاحب سے کروں گا کہ موجودہ دور میں صرف علماء ہی سارا کردار ادا نہیں کر سکتے، حکمرانوں کا کردار بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے، لیکن اب انہیں انتہائی مقدس اور احترام سے لیے جانے والے الفاظ سے بدنام کرنے کی کوشش کی جا رہی ہے، جیسا کہ صدر زرداری نے 'مولوی' کا لفظ انتہائی ہتک آمیز انداز میں استعمال کیا ہے۔ مولوی، حاجی، خلیفہ، امیر جیسے اچھے الفاظ کو لوگوں کو بدنام کرنے کیلئے بطور گالی استعمال کیا جا رہا ہے، کیا اس سے علماء کی تضحیک نہیں ہوگی اور اس سے ملک میں بدامنی پیدا نہیں ہوگی؟

جواب: (مولانا یٰسین ظفر) میں نے اپنی گفتگو میں یہ بات کی تھی کہ علماء انبیاء کے وارث ہیں اور انبیاء کا پہلا مقصد توحید کا پیغام پہنچانا تھا۔ اس حوالے سے علماء کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ بھی اپنی بات کا آغاز عقیدۂ توحید سے کریں۔ آپ یہ نہ سوچیں کہ معاشرے کے سارے لوگ عقیدۂ توحید کو سمجھتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ ظاہری طور پر ایسے بہت سے امور ہیں جو توحید کے منافی ہیں۔ اب ہم اس بحث میں نہیں جائیں گے، اس حوالے سے ہمیں اسلام نے جو تعلیم دی ہے، وہ بڑی واضح ہے۔ اس وقت جو ملکی حالات ہیں، ان میں ہمارے حکمرانوں نے اللہ کے دربار سے ہٹ کر ایسے لوگوں کے سامنے اپنے مسائل رکھے ہیں جو خود اپنے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں جیسا کہ وہ امریکہ سے اپنی دادرسی چاہتے ہیں لیکن ہم سمجھتے ہیں کہ مسلمان مشکل کے وقت صرف اللہ کی طرف رجوع کرتا ہے۔ جہاں تک شرک کا معاملہ ہے تو میری نظر سے ایسا کوئی فتویٰ نہیں گزرا، جس میں شرک کے معاملے پر کسی کو واجب القتل قرار دیا گیا ہو۔ یہ صورتحال خودکش حملوں یا جہاد کی موجودہ صورت کے حوالے سے فتویٰ دینے سے پیدا ہوئی، لیکن ان کا شرک سے کوئی تعلق نہیں۔

جواب: (ڈاکٹر ابوالحسن شاہ) محترم علامہ فرحت حسین شاہ صاحب نے یہ سوال اٹھایا ہے کہ وہ کونسے طریقہ ہائے تدریس ہیں، جن کے ذریعے بدامنی اور انتشار کو ختم کیا جا سکتا ہے۔ میں نے اس کو تقریر میں واضح کرنے کی کوشش کی تھی۔ تدریس اور تقریر دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ علماء کرام

مدارس میں اپنے طلباء کو جو تعلیم دیتے ہیں، وہ تدریس کہلاتی ہے اور خطیب مساجد میں لوگوں سے جو خطاب کرتے ہیں، اسے تقریر کہتے ہیں۔ ان دونوں حضرات کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کے مطابق اپنے مسلک کی تبلیغ فرمائیں۔ قرآن وحدیث ہمارا ماخذ ہونا چاہیے۔ دوسرا موضوعات کے حوالے سے میری گزارش یہ ہے کہ ان نکات پر زیادہ بات کی جائے جن پر ہمارا اتفاق ہے، مثال کے طور پر اخلاقیات، معاملات، معاشرت اور عبادات۔ یہ وہ موضوعات ہیں جن پر تمام مسالک کا آپس میں کُلی اتفاق ہے۔ اسی طرح تمام مسالک کے درمیان عقائد پر بھی 90 فیصد اتفاق ہے، مثلاً توحید، رسالت، وحی، ملائکہ اور یوم قیامت پر سب مکاتبِ فکر کا اتفاق ہے۔ اگر کسی موضوع پر ان مسالک کا آپس میں اختلاف بھی ہو تو وہ اپنے عقیدت مندوں کو برداشت کا سبق دیں۔ اختلافِ رائے مستحسن عمل ہے، لیکن اختلاف برائے اختلاف غیر مستحسن ہے۔

رائے: (ڈاکٹر خالد مسعود) آپ لوگوں کے سوالات اور جوابات سے کئی باتیں سامنے آئی ہیں۔ ابہامات بھی آہستہ آہستہ کم ہو رہے ہیں۔ میرا ایک سوال بھی ہے اور تجویز بھی، کیونکہ اس وقت اس سیمینار میں تمام مکاتبِ فکر کی نمائندگی ہے تو کیا ایسا نہیں ہوسکتا کہ ہم اپنے اختلافی مسائل کو پسِ پشت رکھتے ہوئے مشترکات کی طرف جانے کی کوشش کریں۔ کیا کوئی ایسی راہ ہے کہ ہم مشترکہ امور پر یا دین کی بالادستی، جس پر سب کا اتفاق ہے، اس پر اکٹھے ہو جائیں؟ اسی طرح بیرونی مداخلت کے خلاف ہم سب اکٹھے ہیں۔ ہمیں ان مشترکات کو عوام کے سامنے لانے کے حوالے سے اقدامات کرنا ہوں گے۔

رائے: (مولانا قاضی محمود الحسن اشرف) توحید کے حوالے سے گفتگو ہو رہی ہے، جیسا کہ علامہ فرحت صاحب نے یہ سوال کیا تھا اور علامہ یٰسین صاحب نے اس کا جواب بھی دیا تھا۔ اس حوالے سے میں ایک گزارش کروں گا کہ توحید کا مسئلہ ایسا نہیں ہے کہ جس میں خدانہ کرے کہ کوئی اختلاف ہو۔ جیسا کہ مولانا زاہد صاحب نے فرمایا کہ توحید کے معاملے میں بریلوی مکتبہ فکر کو اپنے نقطۂ نظر کی تشریح کا حق حاصل ہے۔ اگر ہم ان پر کوئی الزام لگاتے ہیں کہ وہ توحید کے منافی کوئی کام کرتے ہیں یا اس کے برعکس تو یہ بات مناسب نہیں ہے۔ توحید و رسالت پر ہم سب کا اتفاق ہے۔ اگر حضور ﷺ کا تذکرہ کیا جاتا ہے اور آپ ﷺ کی شان کو جس طرح بیان کیا جاتا ہے، اس میں یقیناً یہ نہیں کہا جائے گا کہ اہل حدیث مکتبہ فکر آپ ﷺ کی شان مختلف بیان کرتا ہے۔ یہ جو ہمارے ہاں رجحان بنتا جا رہا ہے کہ اگر کوئی بریلوی مکتبۂ فکر کا کوئی عالم شان رسالت ﷺ بیان کرتا ہے تو دوسری طرف سے کہا جاتا ہے کہ انہوں نے توحید کے منافی بات کر دی ہے۔ اس طریقے سے اگر کوئی مکتبۂ فکر توحید کے حوالے سے بات کرتا ہے تو فوراً یہ کہا جاتا ہے کہ انہوں نے رسول ﷺ کی گستاخی کی ہے۔ اس حوالے سے میں فقہاء کی مثال دینا چاہوں گا کہ حضرت امام شافعی کے ہاں نماز کا جو طریقہ ہے اور حضرت امام ابوحنیفہ کے ہاں جو ہے، اس میں بہتر اور غیر بہتر کے اعتبار سے اور جائز اور ناجائز کے اعتبار سے بھی تعلق ہے۔ جہاں تک مسئلہ بہتر اور غیر بہتر کا ہے تو اس صورت میں ہمارے اکابرین ایک دوسرے کا احترام کرتے تھے۔ جیسا کہ حضرت امام شافعی کوفہ کی جامعہ مسجد امام ابوحنیفہ تشریف لے گئے تو انہوں نے نماز کی امامت کروائی اور اپنی نماز میں احناف کے احترام میں رفع یدین نہیں کیا۔ اگر ہم اسی طرح کے رویے اپنا لیں تو حالات بہت بہتر ہو سکتے ہیں۔ آخر میں یہ تجویز ہے کہ چونکہ ہمارے ہاں بہت ساری چیزوں کا تعلق بدگمانی سے ہے اور اگر ہم بدگمانی کو نظر انداز کر کے حسنِ ظن کو پیش نظر رکھیں گے تو اس طرح ہمارے آپس کے اختلافات ختم ہو جائیں گے۔ میں مولانا ابوالحسن کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ مشترکات کو رواج دینا چاہیے۔

مشاورتی گروپوں کی تجاویز

پہلا گروپ؛ فرقہ واریت کے خاتمے میں علماء کا کردار

منتظمِ بحث: علامہ سید فرحت حسین شاہ (مرکزی ناظمِ اعلیٰ، منہاج القرآن علماء کونسل)

محرک بحث: مولانا عبدالاکبر چترالی (مہتمم، المرکز اسلامی حدیقۃ العلوم، پشاور)

شرکاء؛

مولانا مسعود بیگ (جامعہ بنوریہ، کراچی)

مولانا محمد سلفی (جامعہ ستاریہ، کراچی)

علامہ اکبر حسین زاہدی (جامعۃ الصادق، کوئٹہ)

مولانا عبدالقدوس محمدی (کالم نگار، مذہبی سکالر)

مولانا عطاء اللہ شہاب (رُکن گلگت بلتستان کونسل)

تجاویز

1) جملہ مکاتبِ فکر کے مابین 'مشترکات' کو فروغ دیا جائے۔
2) جملہ مکاتبِ فکر جہلاء کو اپنی اپنی مساجد کے منبر و محراب تک پہنچنے سے روکنے کے لیے عملی اقدامات کریں۔
3) فرقہ واریت کے اسباب کا سدِ باب کیا جائے۔
   الف؛ دل آزار تحریروں اور تقریروں پر پابندی عائد کی جائے۔
   ب؛ فتویٰ نما نعروں سے تمام علماء اپنے اپنے پیروکاروں کو باز رکھیں۔
   ت؛ عالمی استعمار کی سازشوں سے لوگوں کو خبردار کیا جائے۔
4) باہمی احترام اور برداشت کے رویوں کو فروغ دیا جائے۔
5) تمام مکاتبِ فکر کے عقائد پر مشتمل ایک ایسی کتاب مرتب کی جائے جس میں ہر مسلک کا عقیدہ، اس مسلک کے جید علماء کرام پیش کریں۔
6) دانشورانہ فرقہ واریت کا قلع قمع کیا جانا چاہیے۔
7) فرقہ واریت کے خاتمے کے لیے قرآن و سنت کو محور و مرکز بنایا جائے۔
8) لاؤڈ سپیکر کے استعمال کو محدود کرتے ہوئے اسے ضابطہ اخلاق کے تحت کیا جائے۔
9) ملکی سطح پر ایک ایسا فورم تشکیل دیا جائے جو تمام مکاتیبِ فکر کے جید علماء کرام اور مفتیان عظام پر مشتمل ہو اور فتویٰ جاری کرنے کا اختیار اسی

فورم کے پاس ہو۔

10) باہمی تعلقات کے فروغ کے لیے مختلف سرگرمیوں کا اہتمام کیا جائے اور مختلف مسالک کے علمائے کرام ایک دوسرے کی خوشی وغمی میں شرکت کریں۔

11) مختلف مسالک نے موضوعات کی جو تقسیم وتفریق کر لی ہے، وہ ختم کی جائے۔ محرم اور ربیع الاول سمیت دیگر مواقع پر ہونے والی تقاریب میں تمام مکاتبِ فکر کے علماء شریک ہوں۔

12) مذہبی ہم آہنگی کے لیے مدارس کے طلباء کے مابین باہمی روابط کو فروغ دیا جائے اور مکالمے کا آغاز کیا جائے۔

13) دینی مدارس، جامعات اور مساجد کے نام قابلِ قبول ہونے چاہئیں اور اختلافات کا تاثر نہ دیتے ہوں۔

14) ہر مکتبۂ فکر میں جو چند افراد فرقہ واریت کو ہوا دیتے ہیں، ان کا محاسبہ کیا جائے۔

15) توہین آمیز، اشتعال انگیز اور کفر وارتداد کے فتاویٰ پر مشتمل لٹریچر اور مواد ضبط کیا جائے۔

16) علماء کرام مسلک کے پرچار کی بجائے دین کی تبلیغ کو مقدم رکھیں۔

17) ذرائع ابلاغ کو پابند کیا جائے کہ وہ فرقہ واریت کو ہوا دینے والے پروگرام اور مواد نشر نہ کرے۔

18) ملکی سالمیت اور امن وامان کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

19) فرقہ واریت کے نقصانات، خطرات اور تباہ کاریوں کی تقریری اور تحریری صورت میں نشاندہی کی جائے۔

دوسرا گروپ؛ پُرتشدد رجحانات کے خاتمے میں علماء کا کردار

منتظمِ بحث: خورشید ندیم (مذہبی سکالر)

محرکِ بحث: مفتی محمد زاہد (جامعہ امدادیہ، فیصل آباد)

شرکاء:

پیر سید مدثر شاہ (سنٹر فار اسلامک ریسرچ، راولپنڈی)

مولانا فضل الرحمان مدنی (جامعہ اسلامیہ، نوشہرہ)

ڈاکٹر خالد مسعود (سابق سربراہ، اسلامی نظریاتی کونسل)

علامہ محمد حیات قادری (جامعہ غوثیہ رضویہ، ڈیرہ مراد جمالی)

علامہ انیس الحسنین (جامعہ مدینۃ العلم، اسلام آباد)

تجاویز

اس گروپ کی رائے میں معاشرے کو تشدد سے پاک کرنے کے لیے علماء کو تین دائروں میں اپنا کردار ادا کرنے کی ضرورت ہے۔

I: ریاستی امور II: سماجی امور III: دینی امور

1: ریاستی امور

1.1: سیاست میں علماء کے کردار کے تعین کے لیے برصغیر کی تاریخ میں علماء کے سیاسی کردار کی تفہیمِ نو کی جائے۔

1.2: جدید ریاست اور اس کے اداروں سے علماء کو متعارف کروانے کا اہتمام کیا جائے۔

1.3: ریاستی امور میں اصلاح کے لیے پرامن ذرائع اختیار کیے جائیں۔

1.4: علماء اور دیگر طبقات کے درمیان موجود بُعد کو دور کیا جائے۔

2: سماجی امور

2.1: اصلاحِ معاشرہ کے لیے دین کی روحانی تعلیمات اور ان سے متعلق اداروں کا احیاء اور اصلاح کی جائے۔

2.2: سماجی اصلاح کے لیے محراب و منبر کو مزید فعال اور مؤثر بنایا جائے۔

3: دینی امور

3.1: دین کے فہم اور تشریح کے لیے معتبر اور جید علماء سے ہی رجوع کیا جائے۔

3.2: دینی اداروں اور تنظیموں میں خود احتسابی کو رواج دیا جائے۔

3.3: مسلکی ہم آہنگی کے لیے تمام مسالک کا مبنی بر انصاف تعارف شاملِ نصاب کیا جائے۔

3.4: مختلف مسالک کے علماء کے درمیان روابط کو نچلی سطح تک فروغ دیا جائے۔

3.5: فتویٰ دیتے وقت شرعی، اخلاقی اور سماجی اصولوں کو مدِ نظر رکھا جائے۔

3.6: دینی مدارس اور عالمی دینی یونیورسٹیوں میں تعاون اور روابط میں اضافہ کیا جائے۔

3.7: تکفیر، خروج اور دیگر مسائل میں رائے دینے کے لیے تمام مسالک کے جید علماء اور سکالرز پر مشتمل فورم بنایا جائے۔

تیسرا گروپ؛ بدامنی اور عدم توازن کے سیاسی، سماجی اور معاشی محرکات اور ان کا تدارک

منتظمِ بحث: ڈاکٹر عبدالناصر لطیف (مدرسہ اسلامیہ، ضیاء العلوم، مردان)

محرکِ بحث: مولانا مفتی محمد رفیق (جامعہ اسلامیہ بنوری ٹاؤن، کراچی)

شرکاء:

قاری ضمیر اختر منصوری (جامعہ الفلاح، کراچی)

مولانا علی بخش سجادی (مدرسہ ولی العصر، سکھر)

مولانا محمد یونس قاسمی (مدیر، ماہنامہ خلافتِ راشدہ)

مولانا خالد ضیاء (جامعہ محمدیہ، مظفر آباد)

تجاویز

سیاسی محرکات اور ان کا تدارک

1) سیاست میں عدمِ برداشت، سیاست دانوں کی نااہلی اور قیادت کے فقدان کے باعث جمہوری نظام مسائل کا شکار ہے، اس صورتحال میں حکمران طبقے کو اپنی ترجیحات میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہے تاکہ ملک میں سماجی اور معاشی انصاف کے حصول کو ممکن بنایا جا سکے۔
2) سیاست دانوں کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے عوام کو استعمال کرنے اور ان کے حقوق کو پامال کرنے سے گریز کرنا چاہیے۔
3) پاکستان کا طرزِ حکومت قرآن وسنت کے مطابق ہونا چاہیے۔
4) ریاست اور حکمرانوں کو بیرونی طاقتوں کا آلہ کار بننے کی بجائے قومی مفاد کو مقدم رکھنا چاہیے۔
5) پاکستان کا سیاسی نظام دغابازی، مکاری اور منافقت پر مبنی ہے۔ سیاسی اور جمہوری نظام کی درستگی کے لیے مدبر قیادت کو سامنے آنے کی ضرورت ہے۔
6) سیاسی نظام کی درستگی کے لیے علماء کے عملی کردار کی ضرورت ہے۔

سماجی محرکات اور ان کا تدارک

1) عوام کی ناخواندگی، جہالت اور تعلیم سے دوری کا سبب حکمران طبقہ اور وڈیرہ شاہی ہے۔ حکومتی سطح پر معیاری تعلیمی ادارے قائم کرنے کی ضرورت ہے۔
2) مختلف نظامِ ہائے تعلیم مختلف اذہان پیدا کرتے ہیں، اور یہی ذہنی اختلاف معاشرے میں عدم توازن کا سبب بنتا ہے۔ ایک متوازن تعلیمی نظام، جس سے ایک فکر کے لوگ پیدا ہوں، معاشرے میں امن کا سبب بن سکتا ہے۔
3) حکمران طبقہ ملک میں امن وامان کے فروغ کے لیے علمائے کرام اور مذہبی سکالرز کی تجاویز پر سنجیدگی سے غور کرے۔
4) عدمِ مساوات، طبقاتی تقسیم، علماء کی کردار کشی، حکمرانوں کی سرپرستی میں جرائم کا فروغ، اتحاد واتفاق کا فقدان، عصبیت، لسانیت اور اختلاف برائے محاصمت کی حوصلہ شکنی کی جانی چاہیے۔
5) عدلیہ، انتظامیہ اور میڈیا کا کردار مثبت ہونا چاہیے۔

معاشی محرکات اور ان کا تدارک

1) جاگیرداری نظام ایک ناسور کی طرح ہے، جس کا شرعی حل تلاش کرنے کی ضرورت ہے۔
2) معاشی عدمِ مساوات اور دولت کی غیر منصفانہ تقسیم کو ختم کیا جانا چاہیے۔
3) محنت وعمل کے ذریعے ذرائع آمدن کا حصول کم ہوتا جا رہا ہے، محنت کے بغیر حاصل ہونے والے منافع اور ذرائع آمدن کی روک تھام کی

جانی چاہئے۔

4) اسلام کے اصولِ انفاق (صدقہ وزکوۃ) کے فرضی ونفلی احکامات سے لاپرواہی کی جاتی ہے۔ اسلام نے واضح طور پر صدقات اورزکوۃ کے مصارف بتائے ہیں، ان پر سختی سے عمل کیا جانا چاہیے۔

5) سودی نظام اور سرمایہ دارانہ کلچر معاشرے میں بگاڑ پیدا کررہا ہے، جس کا تدارک فوری طور پر ہونا چاہیے۔

6) بجلی کی پیداوار، صنعتوں کا استحکام، زراعت کی پیداوار، فنی مکاسب کی بہتر تنظیم اور ملکی ذخائر کا درست استعمال ملک کے معاشی استحکام کے لیے معاون ثابت ہوسکتا ہے۔

7) بیرونی امداد اور غیر ملکی قرضے لینے کا سلسلہ کم سے کم کیا جائے اور ملک کے اندر ذرائع آمدن پیدا کیے جائیں۔

چوتھا گروپ؛ برداشت کے کلچر کا فروغ کیسے ہو؟

منتظمِ بحث: مولانا بابر حسین بابر (دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، لاہور)

محرکِ بحث: مولانا عمار خان ناصر (نائب مہتمم الشریعہ اکادمی، گوجرانوالہ)

شرکاء:

ڈاکٹر سید محمد نجفی (جامعۃ المنتظر، لاہور)

مولانا یٰسین ظفر (ناظمِ اعلیٰ، وفاق المدارس السّلفیہ)

مولانا عبدالحق ہاشمی (رابطۃ المدارس، کوئٹہ)

پیر فاروق بہاء الحق شاہ (دارالعلوم مدرسہ غوثیہ، چک شہزاد)

مولانا حسن اصغر عسکری (بھارہ کہو، اسلام آباد)

تجاویز

1- برداشت کے کلچر کے فروغ کے لیے معاشرے کے ہر فرد کی تربیت بنیادی حیثیت رکھتی ہے، اس لیے اس کا آغاز گھر کے ماحول سے ہونا چاہیے اور بچوں کو اس کی عملی تربیت دی جانی چاہیے تاکہ وہ ناپسندیدہ صورت حال میں اپنے ردعمل کو منفی ہونے سے بچاسکیں۔

2- متوازن شخصیت کی تعمیر کے موضوع کو تعلیمی نصاب، ذرائع ابلاغ کے پروگراموں، مذہبی خطبات ودروس اور تربیتی ورک شاپس کا باقاعدہ حصہ بنایا جائے۔

3- دینی مدارس اور جدید تعلیمی اداروں کے نصاب میں ایسا مواد شامل کیا جائے جس کا مقصد مختلف افکار کا مثبت تعارف حاصل کرنا ہو اور جس سے دوسرے طبقات کے اندازِ فکر کو دیانت داری اور رواداری کے ساتھ سمجھنے کا رویہ پیدا ہو۔

4- علماء وخطبا دعوت وتبلیغ میں مسلکی پہلو پر توجہ مرکوز کرنے کی بجائے دینی تعلیمات اور اخلاقیات پر توجہ مرکوز کریں، تاکہ حاضرین وسامعین

میں افتراق وانتشار کے بجائے اتحاد کے جذبات پیدا ہوں۔

5- اس بات کو بطور ایک مسلمہ اصول اور قدر کے فروغ دیا جائے کہ ہر طبقے کو اپنے فہم کے مطابق عقیدہ اور رائے رکھنے اور اسے مثبت طور پر بیان کرنے کا حق حاصل ہے۔ نیز یہ کہ کسی بھی طبقے کے نظریات اور عقائد کی وہی تشریح مستند اور قابل قبول ہے جسے وہ خود بیان کرتا ہو۔

6- جن امور میں (چاہے وہ مذہبی واعتقادی ہوں یا فکری، سیاسی وسماجی) اختلاف رائے پایا جاتا ہے، ان میں مخالف نقطۂ نظر پر تنقید کرتے ہوئے علمی رویے کو فروغ دیا جائے۔ اہل علم کے مابین ایسی بحثوں پر علمی رنگ غالب رہنا چاہیے، جبکہ عوامی سطح پر اظہار خیال کرتے ہوئے ہمدردی اور خیر خواہی کی جھلک دکھائی دینی چاہیے۔

7- مختلف طبقہ ہائے فکر کی مستند اور اکابر شخصیات کی ایسی تحریروں کو زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچایا جائے، جن میں برداشت، رواداری اور اختلاف رائے میں آداب کی پابندی کی تلقین کی گئی ہے۔

8- نزاعی امور پر غیر علمی اور سطحی اظہار خیال کے اثرات کا ازالہ کرنے کے لیے متعلقہ موضوعات پر سنجیدہ اور بلند پایہ اہل قلم کی تحریروں کو زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی کوشش کی جائے۔

9- بہت سے اُمور علمی وفکری یا فقہی سطح پر ابہام کا شکار ہیں اور اس ابہام کی وجہ سے عدم برداشت کے رویوں کے لیے گنجائش پیدا ہوتی ہے۔ مثال کے طور پر تکفیر کے اصول وضوابط اور شرائط کیا ہیں؟ معاشرے میں نہی عن المنکر کی حدود، آداب اور اس کا دائرۂ اختیار کیا ہے؟ جہاد کا حق اور اختیار کسے حاصل ہے؟ وغیرہ۔ ان مسائل پر پائے جانے والے ابہام کو سنجیدہ علمی بحث ومباحثہ کا موضوع بنائے بغیر فکری ابہام کو دور نہیں کیا جا سکتا۔

10- برداشت یا عدم برداشت کے مسئلے کو صرف مذہبی طبقات کے تناظر میں دیکھنے کے بجائے اس کا جائزہ ایک عمومی سماجی رویے کے طور پر لیا جائے اور مختلف مذاہب، برادریوں، طبقات اور فکری وسیاسی دھڑوں کے مابین پائے جانے والے عدم برداشت کے رویوں کو یکساں طور پر زیر بحث لایا جائے۔

11- عدم برداشت اور شدت پسندی کے رویوں کے خاتمہ کے لیے ان اسباب (سیاسی، سماجی ومعاشی ناہمواری، ظلم وناانصافی، ناروا اور جارحانہ مذہبی رویے وغیرہ) کو بھی دور کرنا ضروری ہے جن سے یہ رویے پیدا ہوتے ہیں۔

12- تاریخ اور سیرت سے ایسی مثالیں تلاش کر کے انہیں منظر عام پر لایا جائے کہ جب اختلافات کے باوجود معاشرتی تعلقات قائم رکھے گئے۔ اسی طرح اہل علم حضرات کی جانب سے دیگر اہل علم حضرات کے احترام کے واقعات کو نمایاں کیا جائے۔ حج اور عمرے کے موقع پر ہر طرح کے تنوع اور رنگا رنگی اور تحمل وبرداشت کے جو مناظر دیکھنے میں آتے ہیں، ان کی طرف بھی توجہ مبذول کروائی جائے۔

13- برداشت کے کلچر کو فروغ دینے کے لیے دنیا کے دیگر مسلم وغیر مسلم ممالک میں جو کامیاب کوششیں کی گئی ہیں، انہیں ذرائع ابلاغ کے ذریعے لوگوں تک پہنچایا جائے اور ان کی رہنمائی کی جائے۔

14- مختلف الخیال طبقات (مسلم وغیر مسلم، مذہبی وغیر مذہبی وغیرہ) کے مابین مکالمے کا عمل ایک تسلسل کے ساتھ جاری رکھا جائے اور ایسا کرتے ہوئے شدت پسندانہ رجحانات رکھنے والے عناصر کو نظر انداز کرنے کی بجائے انہیں بھی مکالمہ کے عمل میں شریک کرنے کی کوشش کی جائے۔

15- معاشرے کے مختلف طبقات کے باہمی تنازعات کو صرف ان کا مسئلہ قرار دینے کی بجائے اس رجحان کو فروغ دیا جائے کہ ایک طبقہ دوسرے طبقے کے مسائل میں دلچسپی لے اور ان کے داخلی تنازعات کو کم سے کم کرنے اور افہام وتفہیم کی فضا پیدا کرنے کے لیے پل کا کردار

ادا کیا جائے۔

16- معاشرے کی سربرآوردہ شخصیات کی طرف سے سیرت نبویؐ کی اتباع میں ایسے نمونے پیش کیے جائیں جن میں مخالفین کی طرف سے ناروا یا جارحانہ طرزِ عمل کا جواب اچھے برتاؤ، حسن سلوک اور درگزر سے دیا جائے۔

17- مختلف الخیال طبقات کی اہم شخصیات کے باہمی روابط کا عوامی سطح پر اظہار کیا جائے اور باہمی میل ملاقات اور سماجی تعلقات کو عوام کے سامنے نمایاں کیا جائے تاکہ عوام تک ایک مثبت پیغام پہنچے اور شدت پسندی کے رجحانات میں کمی لائی جا سکے۔

18- مختلف مسالک کے ذمہ دار حضرات اپنی تحریروں، بیانات اور خطبات میں مختلف حوالوں سے دوسرے طبقۂ ہائے فکر کے خیالات یا خدمات یا ان کے ساتھ اپنے روابط کا ذکر کریں۔ ایسے مشترکہ فورمز بھی تشکیل دیئے جائیں جہاں ہر طبقۂ فکر سے وابستہ افراد اجتماعی مسائل پر غور وخوض کریں۔

19- ہر طبقۂ فکر جس حد تک ممکن ہو، داخلی احتساب کا نظام وضع کرے اور شدت پسندانہ رجحانات کی حوصلہ شکنی کی جائے اور کسی بھی حال میں شدت پسند عناصر کی واضح یا ملفوف تائید نہ کی جائے۔

20- PIPS اور اس طرح کے دوسرے ادارے مختلف طبقات کے مابین مکالمے کے فروغ کے لیے پل کا کردار ادا کریں اور معاشرتی مسائل پر تجزیاتی ومعلوماتی مواد ہر طبقے کے رجحان ساز افراد تک پہنچانے کا اہتمام کریں۔

پانچواں گروپ؛ مدارس کا کردار

منتظم بحث:	ڈاکٹر ابوالحسن شاہ (دارالعلوم محمدیہ غوثیہ، بھیرہ)
محرکِ بحث:	مولانا زکریا ذاکر (جامعہ سلفیہ دعوۃ الحق، کوئٹہ)
شرکاء	
	علامہ سید جواد ہادی (مدرسہ عارف الحسینی، پشاور)
	مولانا شمشاد (جامعہ محمدیہ، اسلام آباد)
	مولانا انوار الحق حقانی (مرکزی جامعہ مسجد، کوئٹہ)
	مولانا عبدالسلام (اسلام آباد)
	مولانا ضیاء نقشبندی (ماہنامہ فکرِ مومن، لاہور)

تجاویز

1: معاشرے کی خرابی کے ذمہ دار صرف علما اور مدارس ہی نہیں ہیں، اس ضمن میں دیگر عناصر کے کردار پر بھی گفتگو ضروری ہے۔

2: طلبہ اور سامعین میں تنقید سننے کا حوصلہ ہونا چاہیے۔

3: ہر طبقہ میں شر پسند اور اختلاف پھیلانے والے عناصر سے برأت کا اظہار کیا جانا چاہیے۔

4: مدارس کی لائبریریوں میں تمام مکاتبِ فکر کی کتب موجود ہونی چاہئیں۔

5: ہر مسلک کی تشریح اس مسلک کا نمائندہ ہی کرے۔

6: مدارس میں مثبت اختلافات کی حامل نصابی کتب پر زیادہ توجہ دی جائے۔

7: مدارس کے طلباء کو عصری علوم کے بارے میں بنیادی واقفیت اور آگاہی دی جائے۔

8: حکومت اہلِ مدارس اور علماء کی معاشی ضروریات کو معاشرے سے ہم آہنگ کرنے کے لیے اقدامات کرے۔

9: علماء کی فکری نشوونما کے لیے اُن کی حالاتِ حاضرہ سے آگاہی پیدا کرنے کے لیے خصوصی نشستوں کا اہتمام کیا جائے۔

10: مدارس کے اساتذہ اور عملہ کی اعلیٰ تربیت کا اہتمام کیا جائے اور ان کی صلاحیتوں میں اضافہ کیا جائے۔

11: دوسرے مسالک کے حوالے سے فتاویٰ دینے کے معاملے میں احتیاط کی جائے۔

12: مختلف مکاتبِ فکر میں موجود مشترک نکات کو اجاگر کیا جائے اور فروعی اختلافات کو علمی درسگاہوں تک محدود رکھا جائے یا انہیں اس طرح بیان کیا جائے کہ مذہبی کشیدگی میں اضافہ نہ ہو۔

13: مختلف مذہبی ایام پر مدارس و مساجد میں مشترکہ اجتماعات منعقد کیے جائیں۔

14: اہلِ مدارس کی تعلیمی اسناد کو دنیاوی تعلیمی اسناد کے مساوی تسلیم کر کے امتیازی سلوک ختم کیا جائے، تاکہ مدارس سے فارغ التحصیل افراد بھی حکومتی اور نجی اداروں میں اپنی خدمات سرانجام دے سکیں۔

15: ''کسی کے مسلک کو چھیڑو، نہ اپنے مسلک کو چھوڑو'' کی پالیسی کو عام کیا جائے۔

آخری نشست

صدارت؛ مولانا مفتی منیب الرحمان
چیئرمین رؤیت ہلال کمیٹی، صدر تنظیم المدارس

صدارتی خطبہ

سب سے پہلے میں یہ عرض کردوں کہ جو سفارشات اس سیمینار میں پیش کی گئی ہیں، اُن میں سے بعض مثبت اور مناسب ہیں، لیکن نتیجے کا دارومدار عمل پر ہے۔ ایک محاورہ ہے کہ افعال کی جو آواز ہے، وہ الفاظ کی آواز سے زیادہ توانا اور مؤثر ہوتی ہے، چنانچہ جب یہ عزائم یا سفارشات عمل میں ڈھلیں گی تو نتیجہ برآمد ہوگا، ورنہ اس کی اہمیت ایک ذہنی مشق سے زیادہ نہیں رہے گی۔ کچھ سفارشات جیسا کہ تکفیر، خروج، نہی عن المنکر کے دائرہ کار کے تعین یا فتویٰ کے اجراء کے لیے ایک ادارہ کی تشکیل، پر عمل کرنا مشکل ہے۔ اس لیے اسے ایک رائے سمجھا جائے، لیکن یہ دعویٰ نہ کیا جائے کہ ملک کے تمام دینی اور مذہبی طبقات کی نمائندگی کا حق اور اختیار ہمارے پاس موجود ہے، لیکن اس کو ہم نشانِ راہ بنا سکتے ہیں کہ ان امور پر ایسے علماء جن کی حیثیت اپنے اپنے مکاتبِ فکر میں مقتدیٰ کی ہے، انہیں محدود تعداد میں یکجا کر کے ان امور پر اگر اجماعِ کلی یا اکثری ہو سکے تو پھر انہیں وسیع تر قبولیت مل سکتی ہے۔ میرے ذہن میں یہ تھا کہ اس وقت ہمارا ملک جس آگ میں جل رہا ہے، ہم اسے براہِ راست زیرِ بحث لائیں گے کہ ملک کو اس آگ وخون کے کھیل سے کیسے بچایا جائے اور میرا خیال یہ تھا کہ PIPS نے ملک کو اس ابتلاء سے نکالنے کے لیے اس فورم کا انعقاد کیا، لیکن جیسا کہ آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے علماء کو کسی موضوع پر مقید کرنا ناممکن ہوتا ہے اور وہ ساری چیزوں کا احاطہ کر لیتے ہیں تو یہاں بھی ایک وسیع ایجنڈا سامنے آ گیا، لیکن جو اس وقت کا مسئلہ ہے، وہ تخصیص کے ساتھ زیرِ بحث نہیں لایا جا سکا کہ ہم قوم کو امید کی کوئی کرن دکھا سکیں۔ میرے نزدیک اس وقت ملک کا سب سے بڑا مسئلہ جس سے ہم دوچار ہیں، وہ عمودی اور افقی اور گہرائی اور گیرائی کے اعتبار سے ہمارے معاشرے میں نفوذ کر چکا ہے اور یہ بڑا گھمبیر مسئلہ ہے۔ اس کی مثال ایک ٹیومر یا کینسر کی نہیں کہ آپ ایک عضو کاٹ دیں اور اس کا علاج کر لیں تو جسم دوبارہ صحت مند ہو جائے گا۔ اس کی مثال شوگر، بلڈ پریشر اور بخار کی ہے جو کسی وقت بھی جسم کے کسی حصے کو متاثر کر سکتا ہے، اور جسم کا کوئی حصہ بھی اس سے محفوظ نہیں۔ اسی طرح یہاں اپنے آپ کو کوئی محفوظ تصور نہیں کر سکتا، حتیٰ کہ ہمارے وہ حساس دفاعی ادارے بھی محفوظ نہیں، جنہوں نے قوم کا دفاع کرنا ہے۔ یہ مسئلہ ہمہ گیر اور خطرناک حد تک آگے بڑھ چکا ہے۔

اس مسئلہ کے اسباب کو دو طرح کے اندازِ فکر کے تحت زیرِ بحث لایا جاتا ہے، ایک تو وہ جس کا ابتداء میں ڈاکٹر فرید پراچہ نے ذکر کیا اور عالمی طاقتوں کو اس کا ذمہ دار قرار دیا۔ جن میں اسرائیل، انڈیا، امریکہ، یورپ، یہود و ہنود اور استعمار شامل ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ سرگرم ہیں اور ان عوامل کا ذکر کرنا چاہیے، لیکن اگر یہ فرض کر لیا جائے کہ ہمیں آگ سے نکالنا ان کی ذمہ داری ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ پاکستان کی بقاء وسلامیت کی ذمہ داری ہماری نہیں، کسی اور کی ہے جو کہ اپنا کام صحیح طور پر نہیں کر رہا، لہٰذا اس کی مذمت اور ملامت کرو اور اس کے خلاف نعرے لگاؤ اور تحریک چلاؤ۔ میرے خیال میں پہلی اصابت رائے یہ ہے کہ ہم ادراک کریں کہ یہ ذمہ داری ہماری ہے، اور اس کا امریکہ، یورپ اور یہود و ہنود سے کوئی

تعلق نہیں ہے۔اور جب تک ہم اپنی کمزوریوں اور ناکامیوں کا اعتراف نہیں کریں گے اور ان مسائل کو اپنی ذمہ داری نہیں سمجھیں گے اور کسی اور پر ذمہ داری ڈال کر ہم اپنے گھر کو نہ تو بچا سکتے ہیں اور نہ دوبارہ تعمیر کر سکتے ہیں۔اس لیے میرا ہمیشہ سے یہ مؤقف رہا ہے کہ اگر ہم امریکہ یا یہود و ہنود کو جواب دینا چاہتے ہیں تو ہم اپنے ملک کو متحد، پُرامن اور منظّم کر کے جواب دیں کہ یہ ہمارے مخالفین کی سازشیں تھیں اور ان کے تدارک کے لیے ہم نے یہ اقدامات کیے۔حال ہی میں ترکی کی نشاۃِ ثانیہ ہمارے سامنے ایک بڑی مثال ہے۔اس وقت ترکی کی کرنسی 55 پاکستانی روپوں کے برابر ہے اور ترکی دنیا کی پندرہویں یا سترہویں بڑی معیشت ہے۔وہاں امن و استحکام قائم ہوا ہے اور ترقی ہو رہی ہے۔ہمیں بھی قوم کی نشاۃ اور استحکام کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے اس کے لیے اقدامات کرنا ہوں گے۔اگر ہم نے دوسروں کو ذمہ دار قرار دینے کی روش برقرار رکھی تو پھر ہم اس پستی سے کبھی نہیں نکل پائیں گے۔

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ ہمارے ہاں کئی طرح کے جبر ہیں، داخلی جبر ہیں جبکہ خارجی جبر تو اپنی جگہ موجود ہیں۔جیسا کہ آپ لوگ امریکہ یا کسی اور قوت کی ڈکٹیشن کا ذکر کرتے ہیں۔داخلی جبر بھی بہت سارے ہیں، اور ہر مکتبۂ فکر کا اپنا بھی ایک جبر ہے۔کوئی اس کو آسان نہ سمجھے۔ہم پشاور میں ایک میٹنگ میں شریک تھے، اُس وقت پشاور میں تواتر کے ساتھ خودکش حملے ہو رہے تھے تو میٹنگ میں ذکر آیا کہ خودکش حملوں کے بارے میں بھی بات کر لی جائے تو انہوں نے کہا کہ آپ اسلام آباد میں بیٹھ کر اس کے بارے میں بات کر سکتے ہیں، لیکن ہم یہاں پشاور میں بیٹھ کر ایسی کوئی بات نہیں کر سکتے۔یہ ایک زمینی حقیقت ہے۔میں نے ایک صاحب سے پوچھا کہ جب پشاور کے بازاروں میں دھماکے ہوتے ہیں تو کیا یہاں کے خطباء جمعہ کے خطبات میں ان کا ذکر کرتے ہیں؟ تو وہ کہنے لگے کہ بالکل ذکر نہیں کرتے، جیسا کہ یہاں سرے سے کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں۔اگر کوئی ذکر کرتا بھی ہے تو یہ کہے گا کہ امریکہ یہ کر رہا ہے یا بھارت یہ کر رہا ہے تو یہ بھی جبر کی ایک صورت ہے تو جب تک ہم اس جبر کا مل کر مقابلہ نہیں کریں گے اور اگر کوئی سچ کراچی میں نہ بولا جا سکے یا لاہور، اسلام آباد یا پشاور میں نہ بولا جا سکے تو جب تک ہم ہر جگہ سچ بولنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے، ہم کامل اصلاح نہیں کر سکتے۔

مسالک کے اختلافات کو حل کرنے کی کوشش چھوڑیئے۔یہ پہلے بھی رہے ہیں اور اب بھی رہیں گے۔ان کو ہم اور آپ کبھی نہیں مٹا سکتے۔ملک جن مسائل سے دوچار ہے، انہیں حل کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ ہم سب نے اس ملک اور اسی آشیانے میں رہنا ہے۔اس لیے اس کی حفاظت ہماری ذمہ داری ہے۔اس کے ساتھ ساتھ میں یہ بھی کہنا چاہوں گا کہ کچھ لوگ حقائق کو پوشیدہ رکھنے کے لیے یہ الزام لگاتے ہیں کہ یہ سی آئی اے یا را (RAW) یا موساد کے ایجنٹ ہیں اور فلاں پیسہ دے رہا ہے۔را، موساد یا سی آئی اے ملوث بھی ہے تو ان کے آلۂ کار تو ہمارے ہی لوگ بنتے ہیں اور اگر انہوں نے یہاں اپنا انٹیلی جنس نیٹ ورک بنایا ہے تو یہاں ان کے ایجنٹ بھی ہیں۔جب تک ہم اپنے تساہل اور اپنے مسائل کو زیرِ بحث نہیں لائیں گے اور ان باتوں کو جواز بناتے رہیں گے تو تب تک یہ مسئلہ حل نہیں ہوگا۔ایک طبقہ وہ ہے جس نے اس بات کو ایمان اور عقیدے کا درجہ بنا لیا ہے کہ چونکہ اب حکومت امریکہ کی غلام ہے، لہٰذا اس ملک کے سارے ادارے، عوام، مارکیٹیں، بازار، مساجد اور مزارات، جس کو مرضی چاہیں نشانہ بنا دیں کہ نہ مرنے والے کو پتہ ہوتا ہے کہ اسے کس سبب سے مارا گیا اور نہ مارنے والے کو۔اس مسئلہ کو ہم سب مل کر اتفاق رائے سے حل کر سکتے ہیں، لیکن اس کے لیے تمام بڑے اور اکابر علماء کو سامنے آنا ہوگا اور ایک سے زائد مرتبہ حجتِ شرعی کو تمام کرنا پڑے گا، کیونکہ بعض لوگ حالات کے جبر کی وجہ سے یہ سیاسی بیان دیتے ہیں کہ ہاں یہ خودکش حملے حرام ہیں، یہ بات حرام ہے اور یہ بات حرام، مگر چونکہ یہ ڈرون حملے ہو رہے ہیں اور چونکہ امریکہ یہ کر رہا ہے اور حکمران یہ کروا رہے ہیں تو ردِعمل میں خودکش حملے ہو رہے ہیں۔اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ حلال بھی ہیں اور حرام بھی۔ان کے بارے میں ہمیں کھُل کر بات کرنا ہوگی۔ان کے بارے میں مَیں نے ایک بزرگ سے پوچھا تو انہوں نے کہا؛ دیکھیں جی! چونکہ یہاں بہت سے عناصر سرگرم ہیں اور باہر کی ایجنسیاں بھی فعال ہیں اور اس مقصد کے لیے باہر سے پیسہ بھی آ رہا ہے۔میں نے کہا کہ میں

آپ سے اتفاق کرتا ہوں کہ یہ امریکہ، اسرائیل یا ہنود کروا رہے ہیں، وہ تو کفر ہی پھیلائیں گے، اسلام تو نہیں پھیلائیں گے۔ پھر ہمیں اس کے بارے میں دوٹوک بات کرنے سے ایک لمحہ بھی اجتناب نہیں کرنا چاہیے۔ یہ ہمارے سامنے ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے اور اس کو مل کر عبور کرنے کی ضرورت ہے۔

حکومت کا مسئلہ یہ ہے کہ وہ واضح نہیں ہے۔ صدر صاحب کہتے ہیں کہ یہ ہماری جنگ ہے اور ہمارے تیس، پینتیس ہزار لوگ ہلاک ہو چکے ہیں۔ حکومت بھی یہ کہتی ہے کہ یہ ہماری جنگ ہے۔ اگر میں اپنے گھر کو بچانے کیلئے جنگ کروں تو میں اپنے پڑوسی سے اس کی اجرت تو نہیں لوں گا، کیوں کہ میں اپنے گھر کا تحفظ کر رہا ہوں اور یہ میری ذمہ داری ہے، لیکن ہم اپنے حاکم سے ایک دن سنتے ہیں کہ یہ ہماری جنگ ہے اور اگلے دن سنتے ہیں کہ ہمیں معاوضہ پورا نہیں مل رہا۔ یہ جو تضاد ہے اس نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر یہ آج کی تاریخ میں اعلان کر دیں کہ یہ ہماری جنگ ہے اور پاکستان کی سرحد کے اندر جو بھی فساد کرے گا، وہ پاکستان کا دشمن ہے اور ہمارا نہ امریکہ کی جنگ سے کوئی تعلق ہے اور نہ یورپ کی اور نہ کسی اور جنگ سے اور نہ ہی کسی سے معاوضہ چاہیے، تو یقین جانیے کہ پھر آپ ایکشن لیں گے تو اس کے بعد لوگوں کی اپروچ مختلف ہوگی اور نتائج بھی مختلف ہوں گے۔ حکمرانوں کے اس تضاد نے ہمیں تباہ کر دیا کہ جنگ ہماری ہے اور قیمت ہم باہر سے لے رہے ہیں۔ جس جنگ کی قیمت لی جاتی ہے، اس میں تو کرائے کے سپاہی ہوتے ہیں۔ کام ہم اپنے گھر کے تحفظ کے لیے کر رہے ہوں اور کرایہ کسی اور سے وصول کریں تو یہ بات سمجھ میں آنے والی نہیں ہے۔ کچھ باتیں ان کو چوری چھپے کہنی چاہئیں لیکن وہ یہ باتیں بھی کھلے عام کہہ رہے ہیں۔ دوسری بات یہ کہ خودکش حملوں کے خلاف سب سے پہلے فتویٰ میں نے دیا جو کہ شرعی طور پر بالکل خالص ہے اور اسے اٹھارہ علماء کی تائید بھی حاصل تھی۔

یہ نہ سمجھا جائے کہ جب ہم باہر جائیں گے تو ہماری لیے الگ قطار ہوگی۔ جو پاکستانی ہے یا جس کے پاس یہ پاسپورٹ ہے، اس کے ساتھ ایک جیسا سلوک ہی ہو رہا ہے۔ وہ پاکستان جس کا خواب ہمارے اکابرین نے دیکھا ہوگا اور وہ پاکستان جس کے تصورات ہم اپنے دل میں سجائے بیٹھے ہیں، یہ وہ پاکستان تو نہیں ہے کہ جہاں سے گزریں، وہاں رکاوٹیں اور فصیلیں ہیں۔ بلکہ دنیا بھر کے ہوائی اڈوں پر جو مسافروں کی قطاریں لگی ہوتی ہیں، اس کی ذمہ داری بھی ہم پر عائد ہوتی ہے۔ کیا مسلمانوں اور اسلام پر یہ وقت بھی آنا تھا؟ کیا میرے پیارے وطن کو اس حالت سے بھی دوچار ہونا تھا؟

ہمارا صاحب اقتدار طبقہ ہے کہ عوام کے درمیان بھی نہیں نکل نہیں سکتا۔ یہ وہ صورتحال ہے جس سے ہم دوچار ہیں۔ اگر کوئی کہے کہ صرف حکمرانوں یا سیاست دانوں، یا عدلیہ یا وکلاء یا پھر علمائے کرام کا طبقہ انفرادی طور پر ان مسائل کے حل کا ذمہ دار ہے تو ایسا ہرگز نہیں۔ یہ مرض ہمہ گیر ہے، جب تک ہم ہمہ گیریت کے ساتھ مشترکہ طور پر کوئی قومی ایجنڈا نہیں بنائیں گے اور اس کی پشت پر سارے نہیں کھڑے ہوں گے، خواہ کوئی پارلیمنٹ کا حصہ ہے یا نہیں اور اس جنگ کو اپنی جنگ تسلیم نہیں کریں گے، تب تک ہم اس آگ میں ہی جھلستے رہیں گے اور یہ پھیلتی رہے گی اور اب یہ آگ ہمارے گلی کوچوں میں بہت اندر تک نفوذ کر چکی ہے۔ ہمیں کم از کم آنے والی نسلوں کو ایک پرامن پاکستان دینا چاہیے اور سب کو مل کر اس کے لیے کوشش کرنی چاہیے۔

مجھے یہ کہا گیا تھا کہ ہمارے صدر صاحب نے اپنے مخالف حریف میاں نواز شریف کے الزام کے جواب میں ان پر مولوی کا طعنہ کسا اور کئی مرتبہ مولوی نواز شریف، مولوی نواز شریف کہا اور پیپلز پارٹی کی ایک محترمہ نے کہا کہ مولوی نہیں، مُلا کہنا چاہیے، لیکن جب مولوی فتویٰ جاری کرتے ہیں، تو فون آتا ہے اور پوچھتے ہیں کہ ہم سے کیا غلطی سرزد ہوئی ہے؟ مولوی بھی مقدس لفظ ہے اور ملا بھی۔ ملا ایک ایسا لفظ ہے، جنہوں نے ہماری درسِ نظامی کی کتابیں لکھی ہیں، ان میں سے اکثر کے ساتھ ملا لکھا ہوتا ہے تو یہ تقریر جس میں انہوں نے مولوی کو ایک گالی اور اہانت کی علامت کے طور پر استعمال کیا۔ جب آپ ایسے کام کریں گے تو کیا آپ کو احترام ملے گا؟ جب آپ یہ کام کریں گے تو کیا مذہبی طبقات کے دلوں میں آپ کیلئے

کوئی گنجائش پیدا ہوسکتی ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس سے آپ شدید نفرت کرتے ہیں، اس کو آپ مولوی کہہ کر اندر کی آگ کو ٹھنڈا کرنا چاہتے ہیں۔ یہ قابلِ مذمت ہے اور غیر مشروط طور پر قابلِ مذمت ہے اور جو میڈیا کے لوگ ہیں، یہ ان کو بتائیں کہ کیا اُردو، پنجابی یا انگریزی زبان میں غصے کو نکالنے کیلئے الفاظ ختم ہوگئے ہیں۔ تو جب حکمرانوں کا رویہ یہ ہوگا تو معاشرے پر منفی اثرات تو مرتب ہوں گے۔

اس کے بعد میں کہنا چاہتا ہوں کہ خرابی کہاں سے پیدا ہوئی، مسالک بھی موجود تھے اور حتیٰ کے ایک دوسرے کے خلاف فتاویٰ تک بھی موجود تھے۔ کبھی کسی کو دھکے دے دیئے، کسی کو تھپڑ مار دیا اور کبھی ایسا ہوا کہ لاٹھی کا استعمال کیا گیا ہو۔ لیکن اس وقت ہم جس صورتحال سے دوچار ہیں، وہ یہ ہے کہ دلیل اور استدلال کی طاقت کے استعمال کرنے کی بجائے اپنے موقف کو ثابت کرنے کیلئے اسلحے کی طاقت کو استعمال کیا جارہا ہے۔ اسلحے اور گولی نے دلیل کی جگہ لے لی اور یہ ہماری بربادی کا سبب ہے۔ آپ مناظرے کریں، دلیل و استدلال سے کریں، دلیل سے اپنی بات لکھیں لیکن جب تک مذہبی طبقات میں اسلحہ موجود ہے اور ہم اس سے نجات حاصل نہیں کریں گے تو معاشرے میں امن قائم نہیں ہوسکتا۔

اہل مغرب اور امریکہ والے یہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت مدارس میں جو نصاب پڑھایا جارہا ہے، اس میں ایسا کوئی مسئلہ ہے کہ جو معاشرے میں بدمعاش، غنڈے اور دہشت گرد پیدا کرتا ہے۔ ہم ان کو یہ بات باور کروا چکے ہیں کہ یہ نصاب دوسو سال سے پڑھایا جارہا ہے تو دوسو سال سے بدمعاش اور دہشت گرد پیدا نہیں ہورہے تھے۔ تحریکِ پاکستان میں کوئی دہشت گردی نہیں ہوئی، اور نہ ہی اس کے بعد ہوئی۔ اصل میں یہ جہادِ افغانستان کا تسلسل ہے۔ ہم اپنی خرابیوں کی ذمہ داری اوروں پر ڈال دیں گے، لیکن جب سوویت یونین کی فتح ہوئی تو ہم نے کہا کہ یہ ہماری فتح ہے۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ اس میں جو سرمایہ لگا، وہ کسی اور کا تھا اور مقاصد بھی کسی اور کے تھے، لیکن ہم سارا کریڈٹ لینے کیلئے تیار ہیں۔

اگر ہم نے اس ملک میں امن لانا ہے تو ملک کو اسلحے سے پاک کرنا ہوگا، بحث ومباحثے کیلئے دلیل کی زبان کو استعمال کیا جائے اور دلیل کا راستہ اختیار کیا جائے۔ جس ٹریک پر ہم چل پڑے ہیں، اگر اس سے پلٹ کر واپس نہیں آئیں گے تو ہمارے معاشرے میں سکون نہیں آسکتا۔ میں آپ کو متنبہ کرنا چاہتا ہوں کہ جو طبقات اب تک مار کھا رہے ہیں اور جن کے پاس اس وقت اسلحے کی تکنیک و وسائل نہیں، وہ بھی سوچتے ہیں کہ شاید ہمارے پاس جو آخری چارۂ کار ہے، وہ یہی رہ جائے گا، لیکن اللہ نہ کرے کہ وہ وقت آئے۔ اس اسلحہ کو فروغ دینے میں اہل اقتدار کا بہت بڑا دخل ہے۔ لوگ اپنے ملوک کے دین پر ہوتے ہیں اور ان کے کلچر کو ہی اپناتے ہیں۔ ہم لوگ جو پرامن ہیں اور اپنے صاحب اقتدار لوگوں سے رجوع کرنا چاہیں تو ہمیں کوئی جواب نہیں آئے گا، لیکن جو مسلح گروہ ہیں اور جن کے پاس اسلحہ ہے، انہیں فوراً رسپانس مل جائے گا اور ان کی بات بھی سنی جائے گی اور ان کو ملاقات کا وقت بھی دیا جائے گا۔ ہمارے حکمران بزدل ہیں اور بزدل لوگ امانتوں کی حفاظت نہیں کرسکتے۔ اگر اس ملک کو بچانا ہے تو ایک ہی راستہ ہے کہ ایک طویل المدت قومی ایجنڈا بنایا جائے اور پوری قوم اس کی پشت پر کھڑی ہو اور اس ایجنڈے کو جماعتی، گروہی مفادات اور اپنے اقتدار کو طول دینے اور سیاسی مشہوری کا ذریعہ نہ بنایا جائے، کیوں کہ اگر یہ ملک ہے تو یہ حکمران ہیں اور وہ ہم پر حکمرانی کرنے کیلئے موجود ہوں گے اور اگر ملک نہیں ہوگا تو پھر کچھ نہیں رہے گا۔

آخری بات یہ ہے کہ

شکوہ ظلمت شب سے تو بہتر ہے
اپنے حصے کا چراغ جلائے رکھنا

ہمیں ہر چیز کا جواز پیش نہیں کرنا چاہیے، بلکہ پہلا قدم اٹھانا چاہیے اور پہلا قدم اپنی ذات سے اٹھایا جاتا ہے۔ ہم کم از کم یہ عزم کریں اور اپنے مکاتب فکر تک یہ آواز پہنچائیں کہ دین اسلام اور ملک کی سلامتی کا تقاضا ہے کہ ملک میں سلامتی اور امن کو فروغ دینے کی بات کی جائے۔ کچھ روز پہلے ہی میں نے سنا کہ ہمارے اپنے ہی حلقے کے دو علماء کا مناظرہ ہوا تو میں نے کہا کہ لکھ لو، دونوں فاتح ہوں گے اور فتح کا جشن منائیں گے،

اسلام ہار جائے گا، مسلک ہار جائے گا اور یہی ہوا۔ میرے علم میں تو آج تک ایک بھی ایسا مناظرہ نہیں، جس میں ایک فریق نے شکست مانی ہو اور ایک نے فتح۔ اگر چہ مناظرے اور مکالمے جاری رہیں، لیکن اصل بات یہ ہے کہ اپنے مؤقف کو استدلال سے پیش کیا جائے تو یقیناً معقول لوگ آپ کی طرف راغب ہوں گے، اگر چہ ان کی تعداد زیادہ نہیں ہوگی لیکن یہ خوشبو پھیلتی چلی جائے گی اور ایک وقت آئے گا کہ وطن میں مفسدین کیلئے جائے پناہ نہیں ہوگی اور امن کا دور دورہ ہوگا۔ میری رب کی بارگاہ میں التجا ہے کہ ہم نے بہت زیادہ قیمت ادا کر دی ہے اور ہمارا خاصا خون بہہ گیا ہے اور اب ہماری مزید آزمائش نہ ہو۔ اللہ کرے ہمیں ان آفات سے جلد از جلد نجات مل جائے۔

اختتامی کلمات: محمد عامر رانا

معزز مہمانانِ گرامی!

مفتی منیب الرحمٰن صاحب کی بات کے بعد میرا خیال ہے کہ اس پروگرام کو یہاں پر ہی ختم ہو جانا چاہیے۔ قبل ازیں جو نکات رہ گئے تھے، وہ بھی مکمل جامعیت کے ساتھ گفتگو میں آ گئے لیکن صرف ایک بات کہ اس دو روزہ سیمینار سے ہمیں جو توقعات تھیں، شاید وہ بہت زیادہ تھیں لیکن جو ہم نے حاصل کیا، وہ بھی کم نہیں۔ اس دوران ہم نے علماء سے کافی کچھ سیکھا اور مختلف مکاتبِ فکر کے جید علماء کے درمیان ہم آہنگی اور مکالمے کی فضاء دیکھی۔

قومی، ملی اور نظریاتی مسائل پر جس طرح اتفاقِ رائے پیدا ہوا، یہ تقاضا کرتا ہے کہ اس مکالمے کو مزید وسعت دی جائے اور دیگر طبقات کو بھی اس میں شامل کیا جائے۔ آج گلوبلائزیشن کی دنیا میں مکالمہ سب سے بڑا ہتھیار بنتا جا رہا ہے اور اس مکالمے کی قوت کو بڑھانے کیلئے یہ کوششیں جاری رہیں گی۔ ایک بار پھر پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز کی طرف سے ہم تہہِ دل سے مشکور ہیں کہ آپ نے اپنی گوناگوں مصروفیات سے قیمتی وقت نکالا اور انتہائی قیمتی دو دن ہمیں نوازے۔ آئندہ بھی ہم آپ سے تعاون کی امید رکھتے ہیں۔

آپ کی آمد کا شکریہ

تعارف

پاک انسٹی ٹیوٹ فار پیس سٹڈیز (PIPS) غیر سرکاری تحقیقی ادارہ (تھنک ٹینک) ہے اور اس کا مقصد عالمی و علاقائی مسائل کے حوالے سے معروضی تجزیہ اور تحقیق کرنا ہے۔ اس کے مقاصد میں جمہوریت اور امن کے حوالے سے آگاہی پیدا کرنا بھی شامل ہے۔ PIPS جن قومی و علاقائی اور عالمی سٹریٹجک ایشوز پر تحقیق کر رہا ہے، ان میں تنازعات اور ترقیاتی عمل، سیاسی تشدد، مذہبی انتہا پسندی، لسانی کشیدگی، دہشت گردی، معاشیات، طرز حکمرانی اور جمہوریت، خارجہ تعلقات اور پالیسی سازی کے عمل کے حوالے سے تربیت شامل ہے۔ ادارہ مختلف طبقات میں تعاون کو فروغ دینے، عالمی و علاقائی تنازعات کے حل اور ریاست اور معاشرتی طبقات کے درمیان تعلقات کی بہتری کے لیے مکالموں، تربیتی نشستوں اور دیگر تعلیمی پروگراموں کا اہتمام بھی کرتا ہے۔ قومی سطح پر انسٹی ٹیوٹ کا مقصد امن اور رواداری کی تعلیم کو عام کرنا ہے۔ اس کے ساتھ ہی PIPS امن اور سکیورٹی کے حالات کا درست طور پر احاطہ کرنے کے لیے خطے میں سب سے بڑا ڈیٹا بیس بھی تشکیل دے رہا ہے۔

Pak Institute for Peace Studies (PIPS)
www.san-pips.com